فہرست

شذرات	اخلاقی جارحیت	منظور الحسن	۲
قرآنیات	البقرہ (۲: ۲۴۶-۲۴۸)	جاوید احمد غامدی	۵
معارفِ نبوی	اسلام، ایمان، احسان اور قیامت کی علامات	زاویۂ فراہی	۱۱
دین و دانش	قانون معیشت	جاوید احمد غامدی	۲۷
ادبیات	غزل	جاوید احمد غامدی	۶۹

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اخلاقی جارحیت

حقوق کے تحفظ کے لیے ہم مسلمانوں کا لائحۂ عمل مسلح جارحیت ہے۔ گزشتہ تین صدیوں سے ہم اسی پر کاربند ہیں۔ قوم کے مذہبی اور سیاسی پیشواؤں نے اسی کو اختیار کرنے کی تلقین کی ہے اور عوام الناس پوری دل جمعی سے اس پر عمل پیرا ہیں۔ اس کی روح یہ ہے کہ اگر ہم منتشر ہوں تو تشدد آمیز کارروائیوں کے ذریعے سے دنیا کو اپنے مسائل کی طرف متوجہ کریں اور اگر کچھ مجتمع ہوں تو جنگ و جدل سے اپنا حق حاصل کرنے کی جدوجہد کریں۔ یہ لائحۂ عمل اختیار کر کے ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا ہے، اس کی تفصیل کشمیر، فلسطین، افغانستان اور عراق کے موجودہ حالات میں دیکھی جا سکتی ہے۔ تین صدیوں کے حوالے سے ہماری یافت و نایافت کی فہرست بندی کی جائے تو معلوم ہو گا کہ جو کچھ ہم نے حاصل کیا ہے، وہ شکست و تنزل اور غربت و جہالت ہے اور جس سے محروم ہوئے ہیں، وہ عظمت و رفعت اور علم و اخلاق ہے۔ مسلح جارحیت کے اس لائحۂ عمل کو ہم نے ہمیشہ جہاد سے تعبیر کیا ہے اور اس طرح اپنے مزعومہ اقدامات کو یہ عنوان دے کر دنیا کو پیغام دیا ہے کہ اسلامی شریعت خدانخواستہ جنگ و جدل کی علم بردار ہے۔

شریعت کی اصطلاح میں جہاد اقوام کے ظلم و جبر کے خلاف اسلامی ریاست کا مسلح اقدام ہے۔ قرآن مجید کی رو سے اس اقدام کے لیے قوت ایمانی کے ساتھ ساتھ مادی قوت کا حصول ناگزیر ہے۔ مگر ہمارا طرز عمل ہمیشہ یہ رہا ہے کہ نہایت کمزور ایمان اور اسلحے کی قوت سے بالکل محروم ہونے کے باوجود نصرت الٰہی کے دعوے کے ساتھ میدان جنگ میں اترتے رہے ہیں۔ یہ سفاہت ہے یا دین سے ناآشنائی، بہرحال اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہم اپنے لاکھوں رجال کار کو جنگ کی بھینٹ چڑھا کر فارغ ہو چکے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ ہے کہ ہم نے علم و دانش، اصلاح و دعوت اور قومی تعمیر و ترقی کے دروازے بھی بند کر رکھے ہیں۔

چنانچہ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ علم، اخلاق اور رزق کے معاملے میں ہم پر نہایت کس مپرسی کی حالت طاری ہے۔ ہم غربت کے اس مقام پر ہیں کہ ہماری اکثریت بنیادی ضروریات زندگی سے محروم ہے۔ جہالت کی یہ سطح ہے کہ ان علوم سے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بھی غافل ہو چکے ہیں جنھیں خود ہم نے وجود بخشا تھا۔ اخلاقی پستی کا یہ عالم ہے کہ بد دیانتی، دھوکا دہی، ملاوٹ اور قانون شکنی میں دنیا بھر میں ہمارا کوئی ثانی نہیں ہے۔ بے وقاری کی یہ حالت ہے کہ بین الاقوامی معاملات میں ہم پر کوئی اعتماد کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اور مظلومیت کا یہ معاملہ ہے کہ صحیح ہوں یا غلط، ہر حال میں مجرم قرار پاتے ہیں اور سزا کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہماری اس حالت زار کی سب سے بڑی وجہ لائحۂ عمل کی غلطی ہے۔ افغانستان اور عراق کے پے در پے سانحوں کے بعد ممکن ہے کہ ہم اس غلطی کا ادراک کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ اگر ایسا ہو جاتا ہے تو پھر ہمیں مسلح جارحیت کا لائحۂ عمل ترک کر کے اخلاقی جارحیت کے نئے لائحۂ عمل کو اختیار کرنا چاہیے۔ یہی وہ واحد راستہ ہے جسے اپنا کر کوئی کمزور اور مظلوم قوم اپنے لیے تعمیر و ترقی کے بند دروازے کھول سکتی ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیے کہ ہم اگرچہ اپنی تعداد کے لحاظ سے دنیا کی چند بڑی اقوام میں شمار ہوتے ہیں، مگر قوت و استعداد کے لحاظ سے اقوام عالم میں ہمارا کوئی مقام نہیں ہے۔ دنیا کے سیاسی، اقتصادی اور سائنسی و تکنیکی منظر پر ہماری کوئی جگہ نہیں ہے اور نہ اس بات کا امکان ہے کہ مستقبل قریب میں کوئی جگہ پیدا ہو جائے۔ اس اعتراف حقیقت کے بعد ہمیں مسلح جدو جہد کے بجائے غیر مسلح طور پر اخلاقی جدو جہد کا آغاز کرنا چاہیے۔ ہم انفرادی اور اجتماعی اعتبار سے اعلیٰ اخلاقی معیار پر کھڑے ہو جائیں۔ قومی اور بین الاقوامی معاملات، دونوں میں اخلاقی موقف اپنائیں اور اس کے لیے اگر مفادات بھی قربان کرنے پڑیں تو اس سے دریغ نہ کریں۔ اگر تشدد کا سامنا کرنا پڑے تو صبر و استقامت کے ساتھ اس کا سامنا کریں۔ اپنے حقوق کی جدو جہد کو سرتا سر مظلومانہ بنائیں اور ظالم کو یہ موقع نہ دیں کہ وہ کسی بہانے ہم پر حملہ آور ہو سکے۔ اس مقصد کے لیے اگر تنازعات کو یک طرفہ طور پر بھی ختم کرنا پڑے تو اس سے بھی گریز نہ کریں۔ دنیا کے ایوانوں میں ہر حال میں مظلوم کا ساتھ دیں۔ عدل و انصاف کا دامن کسی حال میں نہ چھوڑیں خواہ اس کی زد اپنے قومی وجود ہی پر کیوں نہ پڑے۔ ہر طرح کے تعصب کو بالاے طاق رکھتے ہوئے آزادی، جمہوریت، مساوات اور انسانی ہمدردی جیسی اقدار کا بول بالا کریں۔ ہر حال میں جنگ کی مذمت کریں اور امن و سلامتی کی تلقین کریں۔ مذہبی اور سیاسی اختلافات کو برداشت کریں اور دوسروں کو بھی یہی طرز عمل اپنانے کی نصیحت کریں۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے موجودہ زمانے کی اخلاقی بیداری سے بھر پور فائدہ اٹھائیں، ان اداروں کی تعمیر و ترقی میں کردار ادا کریں جو دنیا میں انسانی حقوق کی آواز بلند کر رہے ہیں اور میڈیا کے تمام ذرائع کو پوری طرح بروے کار لائیں۔

اخلاقی جارحیت، درحقیقت صبر و برداشت اور حکمت و دانش سے عبارت ہے۔ جب کوئی قوم کسی ظالم قوم کے مقابلے میں مجبور و بے بس ہو، جب اس کے پاس دفاع کی معمولی طاقت بھی موجود نہ ہو، جب اقوام عالم میں سے کوئی اس کی مدد کی

ہمت نہ کر سکے اور جب دنیا میں کوئی ایسی عدالت بھی قائم نہ ہو جو اس پر ہونے والے ظلم کو قانون کی قوت سے روک سکے تو اس موقع پر واحد لائحۂ عمل اخلاقی جارحیت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جور وستم کا مقابلہ اخلاق و کردار کی قوت سے کیا جائے۔قومی وجود میں امن، آزادی، استدلال، عدل، صلہ رحمی اور حق پرستی جیسی انسانیت کی مشترک اقدار کو مستحکم کیا جائے اور ان کی بنا پر انسان کے اجتماعی ضمیر کو آواز دی جائے۔کوئی قوم اگر صبر واستقامت سے یہ آواز بلند کرتی رہے تو انسانیت کا اجتماعی ضمیر لازماً اس پر لبیک کہہ اٹھتا ہے۔ بصورت دیگر عالم کا پروردگار اپنی آواز اس آواز میں شامل کر دیتا ہے۔ مظلوم کی دادرسی آسمان سے ہوتی ہے اور ظلم وجبر کی بساط بالآخر لپیٹ دی جاتی ہے۔

ـــــــ منظور الحسن

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورة البقرة

(۵۳)

(گزشتہ سے پیوستہ)

اَلَمْ تَرَ اِلَی الْمَلَاِ مِنْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِ یْلَ مِنْ بَعْدِ مُوْسٰی، اِذْ قَالُوْا لِنَبِیٍّ لَّھُمُ: ابْعَثْ لَنَا مَلِکًا، نُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ. قَالَ: ھَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ کُتِبَ

تم[۶۴۳] نے موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل کے سرداروں کو نہیں دیکھا، جب اُنھوں نے اپنے ایک نبی[۶۴۴] سے کہا: آپ ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دیں[۶۴۵] تاکہ ہم (اُس کے حکم پر) اللہ کی راہ میں جنگ کریں۔ اِس پر نبی نے کہا: ایسا نہ ہو کہ تم پر جہاد فرض کیا جائے اور پھر تم جہاد نہ کرو؟[۶۴۶] وہ بولے: ہم کیوں اللہ کی راہ میں

---

[۶۴۳] یہ اسی واقعے کی تفصیل فرمائی ہے جس کا ذکر اوپر بالاجمال ہوا ہے کہ برسوں کی مردنی کے بعد اللہ تعالیٰ نے کس طرح بنی اسرائیل کو ان کی طرف سے توبہ اور رجوع کے بعد دوبارہ ایک زندہ قوم بنا دیا۔

[۶۴۴] بائیبل میں وضاحت ہے کہ یہ ان کے نبی سموئیل علیہ السلام تھے۔

[۶۴۵] یہاں موقع کلام دوسرا ہے، اس لیے ذکر نہیں ہوا، لیکن بائیبل سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ مقرر کرنے کے اس مطالبے کو اللہ تعالیٰ نے پسند نہیں فرمایا اور انھیں توجہ دلائی کہ وہ اپنے ہاتھوں محکومی کا یہ طوق اپنی گردن میں نہ ڈالیں۔ سموئیل میں ہے:

> ''یہ بات سموئیل کو بری لگی اور سموئیل نے خداوند سے دعا کی اور خداوند نے سموئیل سے کہا کہ جو کچھ یہ لوگ تجھ سے کہتے ہیں، تو اس کو مان کیوں کہ انھوں نے تیری نہیں، بلکہ میری حقارت کی ہے کہ میں ان کا بادشاہ نہ رہوں... اور سموئیل نے ان لوگوں کو جو اس سے بادشاہ کے طالب تھے، خداوند کی سب باتیں کہہ سنائیں اور اس نے کہا کہ جو بادشاہ تم پر سلطنت کرے گا،

عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا. قَالُوْا : وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ، وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِیَارِنَا ، وَاَبْنَآءِ نَا ، فَلَمَّا کُتِبَ عَلَیْھِمُ الْقِتَالُ، تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِیْلاً مِّنْھُمْ ، وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ بِالظّٰلِمِیْنَ .﴿٢٤٦﴾

وَقَالَ لَھُمْ نَبِیُّھُمْ : اِنَّ اللّٰہَ قَدْ بَعَثَ لَکُمْ طَالُوْتَ مَلِکًا. قَالُوْآ : اَنّٰی

جہاد نہ کریں گے، جب کہ ہمیں ہمارے گھروں اور ہمارے بچوں سے دور نکال دیا گیا ہے۔ لیکن (ہوا یہی کہ) جب اُن پر جہاد فرض کیا گیا [٦٤٧] تو اُن میں سے تھوڑے سے لوگوں کو چھوڑ کر باقی سب پھر گئے، اور (حقیقت یہ ہے کہ) اللہ اِن ظالموں سے خوب واقف تھا۔ ٢٤٦

اور (اُن کے اِس مطالبے پر) اُن کے نبی نے اُنھیں بتایا کہ اللہ نے طالوت [٦٤٨] کو تمھارے لیے بادشاہ

اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ وہ تمھارے بیٹوں کو لے کر اپنے رتھوں کے لیے اور اپنے رسالے میں نوکر رکھے گا اور وہ اس کے رتھوں کے آگے دوڑیں گے اور وہ ان کو ہزار ہزار کے سردار اور پچاس پچاس کے جمعدار بنائے گا اور بعض سے ہل جتوائے گا اور فصل کٹوائے گا اور اپنے لیے جنگ کے ہتھیار اور اپنے رتھوں کے ساز بنوائے گا اور تمھاری بیٹیوں کو لے کر گندھن اور باورچن اور نان پز بنائے گا اور تمھارے کھیتوں اور تاکستانوں اور زیتون کے باغوں کو، جو اچھے سے اچھے ہوں گے، لے کر اپنے خدمت گاروں کا عطا کرے گا اور تمھارے کھیتوں اور تاکستانوں کا دسواں حصہ لے کر اپنے خواجوں اور خادموں کو دے گا اور تمھارے نوکر چاکروں اور لونڈیوں اور تمھارے شکیل جوانوں اور تمھارے گدھوں کو لے کر اپنے کام پر لگائے گا اور وہ تمھاری بھیڑ بکریوں کا بھی دسواں حصہ لے گا۔ سو تم اس کے غلام بن جاؤ گے اور تم اس دن اس بادشاہ کے سبب سے، جسے تم نے اپنے لیے چنا ہوگا، فریاد کرو گے، پر اس دن خداوند تم کو جواب نہ دے گا۔ تو بھی لوگوں نے سموئیل کی بات نہ سنی اور کہنے لگے: نہیں، ہم تو بادشاہ چاہتے ہیں جو ہمارے اوپر ہو تا کہ ہم بھی اور قوموں کی مانند ہوں اور ہمارا بادشاہ ہماری عدالت کرے اور ہمارے آگے آگے چلے اور ہماری طرف سے لڑائی کرے۔'' (٨: ٦-٢٠)

[٦٤٦] اصل میں 'ھل عیستم' کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی کیا اس بات کا اندیشہ نہیں ہے؟ اردو زبان میں 'ایسا نہ ہو' کی تعبیر اسی مفہوم کے لیے اختیار کی جاتی ہے۔

[٦٤٧] یہ جہاد فلستیوں کی جارحیت کے مقابلے کے لیے فرض کیا گیا تا کہ بنی اسرائیل ان کے ظلم و عدوان سے اپنے دین و مذہب اور عزت و ناموس کی حفاظت کریں اور اپنے وہ شہر ان سے واپس لے لیں جن پر انھوں نے قبضہ کر لیا تھا۔

[٦٤٨] بائیبل میں ان کا نام ساؤل آیا ہے۔ یہ غالباً ان کا لقب ہے جس سے وہ اپنے غیر معمولی قد و قامت کی وجہ سے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا، وَ نَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ، وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ
الْمَالِ. قَالَ: اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ، وَ زَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ
وَالْجِسْمِ، وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ، وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ. ﴿۲۴۷﴾
وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ: اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ، فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ

مقرر کر دیا ہے۔[۶۴۹] بولے: اُس کی بادشاہی ہم پر کس طرح ہو سکتی ہے، جب کہ ہم اِس بادشاہی کے اُس سے زیادہ حق دار ہیں اور وہ کوئی دولت مند آدمی بھی نہیں ہے؟[۶۵۰] نبی نے جواب دیا: اللہ نے اُسی کو تم پر حکومت کے لیے منتخب کیا ہے اور (اِس مقصد کے لیے) اُسے علم اور جسم، دونوں میں بڑی کشادگی عطا فرمائی ہے۔[۶۵۱] (یہ سلطنت اللہ کی ہے) اور (اپنی حکمت کے مطابق) اللہ اِس کو جسے چاہے، بخش دیتا ہے۔ (تم معاملات کو اپنی تنگ نظروں سے دیکھتے ہو) اور اللہ بڑی وسعت رکھنے والا ہے، وہ ہر چیز سے واقف ہے۔ اور اُن کے نبی نے مزید وضاحت کی کہ (اللہ کی طرف سے) اُس کے بادشاہ مقرر کیے جانے کی نشانی یہ ہے کہ (تمھارا) وہ صندوق[۶۵۲] (تمھارے دشمنوں کے ہاتھ سے نکل کر) تمھارے پاس آ جائے گا جس میں تمھارے پروردگار کی

لوگوں میں مشہور رہے ہوں گے۔ سموئیل میں ہے:

''اور جب وہ لوگوں کے درمیان کھڑا ہوا تو ایسا قد آور تھا کہ لوگ اس کے کندھے تک آتے تھے۔'' (۱۰: ۲۳)

[۶۴۹] اصل میں لفظ 'بعث' استعمال ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بائیبل اور قرآن کی تصریحات کے مطابق سموئیل علیہ السلام نے اس بادشاہ کو اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق منتخب کیا تھا اور اس لحاظ سے ان کی حیثیت گویا خدا کے مبعوث کی تھی۔

[۶۵۰] بنی اسرائیل کے بعض شریروں نے یہ اعتراض اپنی عادت کے مطابق کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ طالوت بنیامین کے قبیلہ سے تھے۔ بنی اسرائیل کے قبیلوں میں یہ سب سے چھوٹا قبیلہ تھا اور طالوت اس کے سب سے چھوٹے گھرانے سے تھے۔ پھر، جیسا کہ بیان ہوا، وہ کوئی مال دار آدمی بھی نہیں تھے۔ سموئیل میں ہے:

''پر شریروں میں سے بعض کہنے لگے کہ یہ شخص ہم کو کس طرح بچائے گا؟ سو انھوں نے اس کی تحقیر کی اور اس کے لیے نذرانے نہ لائے۔ پر وہ ان سنی کر گیا۔'' (۱۰: ۲۷)

[۶۵۱] یعنی یہ خدا کا انتخاب ہے اور اہلیت کی بنیاد پر ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے علم میں بھی وسعت دی ہے اور عمل کی

رَّبِّـكُم، وَ بَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَ اٰلُ هٰرُوْنَ، تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ . اِنَّ

طرف سے (تمھارے لیے ہمیشہ) بڑی سکینت رہی ہے[۶۵۳] اور جس میں وہ یادگاریں بھی ہیں جو موسیٰ اور ہارون کی ذریت نے (تمھارے لیے) چھوڑی ہیں۔ اِسے فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے[۶۵۴]۔ اِس میں، لاریب ایک

قوت بھی عطا فرمائی ہے، لہٰذا جس طرح کی قیادت اس وقت تمھیں چاہیے، اس کے لیے یہ شخص نہایت موزوں ہے۔

[۶۵۲] اصل میں لفظ 'التابوت' استعمال ہوا ہے۔ یہاں اس سے مراد بنی اسرائیل کا وہ صندوق ہے جسے بائیبل میں 'خدا کا صندوق' یا 'خدا کے عہد کا صندوق' کہا گیا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''بنی اسرائیل کے مصر سے خروج کے زمانے سے لے کر بیت المقدس کی تعمیر تک اسی صندوق کو بنی اسرائیل کے قبلہ کی حیثیت حاصل رہی۔ وہ اس کو اپنے خیمۂ عبادت میں ایک مخصوص مقام پر نہایت مخصوص اہتمام کے ساتھ پردوں کے بیچ میں رکھتے اور تمام دعا و عبادت میں اسی کی طرف متوجہ ہوتے۔ ان کے ربی اور کاہن غیبی رہنمائی کے لیے بھی اسی کو مرجع بناتے۔ مشکل حالات، قومی مصائب اور جنگ کے میدانوں میں بھی بنی اسرائیل کا حوصلہ قائم رکھنے میں اس صندوق کو سب سے بڑے عامل کی حیثیت حاصل رہی۔ حضرت موسیٰ کے زمانے تک تو اس میں تورات اور صحرا کی زندگی کے دور کی بعض یادگاریں محفوظ کی گئیں، لیکن پھر اس میں حضرت موسیٰ، حضرت ہارون اور ان کے خاندان کے بعض اور تبرکات بھی محفوظ کر دیے گئے۔'' (تدبر قرآن ۱/۵۷۱)

[۶۵۳] اس صندوق کے ساتھ بنی اسرائیل کو غیر معمولی عقیدت تھی۔ چنانچہ، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، مشکل کے وقت اور جہاد و قتال کے موقع پر ان کے حوصلے کو قائم رکھنے میں اس کو بڑا دخل تھا۔ 'فیه سکینة من ربکم' کے الفاظ سے قرآن نے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

[۶۵۴] یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی اور فلستیوں نے غالباً طالوت کے بعض جنگی اقدامات اور ان میں کامیابی سے مرعوب ہو کر اپنے آپ کو جنگ کے خطرے سے بچانے کے لیے اس صندوق کو ایک گاڑی پر رکھ کر بنی اسرائیل کے علاقے کی طرف ہانک دیا۔ یہ گاڑی بغیر کسی گاڑی بان اور بغیر کسی محافظ کے دو ایسی گائیوں کے ذریعے سے جن کے دودھ پیتے بچے گھروں پر روک لیے گئے تھے، دہنے بائیں مڑے بغیر اپنی منزل پر پہنچ گئی۔ یہ سب، ظاہر ہے کہ فرشتوں کی مدد ہی سے ہو سکتا ہے۔ سموئیل میں اس کی تفصیلات یہ ہیں:

''اب تم ایک نئی گاڑی بناؤ اور دو دودھ والی گائیں جن کے جوا نہ لگا ہو، لو اور ان گایوں کو گاڑی میں جوتو اور ان کے بچوں کو گھر لوٹا لاؤ اور خداوند کا صندوق لے کر اس گاڑی پر رکھو اور سونے کی چیزوں کو جن کو تم جرم کی قربانی کے طور پر ساتھ کرو گے، ایک صندوقچہ میں کر کے اس کے پہلو میں رکھ دو اور اسے روانہ کر دو کہ چلا جائے اور دیکھتے رہنا... سو ان لوگوں نے ایسا ہی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کیا اور دو دودھ والی گائیں لے کر ان کو گاڑی میں جوتا اور ان کے بچوں کو گھر میں بند کر دیا اور خداوند کے صندوق اور سونے کی چُہیوں اور اپنی گلٹیوں کی مورتوں کے صندوقچہ کو گاڑی پر رکھ دیا۔ ان گایوں نے بیت شمس کا سیدھا راستہ لیا۔ وہ سڑک ہی سڑک ڈکارتی گئیں اور دہنے یا بائیں ہاتھ نہ مڑیں اور فلستی سرداران کے پیچھے پیچھے بیت شمس کی سرحد تک ان کے ساتھ گئے اور بیت شمس کے لوگ وادی میں گیہوں کی فصل کاٹ رہے تھے۔ انھوں نے جو آنکھیں اٹھائیں تو صندوق کو دیکھا اور دیکھتے ہی خوش ہو گئے۔'' (۶: ۷۔۱۳)

[۶۵۵] یہ صندوق جب فلستیوں نے چھینا تو بنی اسرائیل کے بزرگوں نے اسے اسرائیل کی ساری حشمت کے چھن جانے سے تعبیر کیا اور پوری قوم کم و بیش بیس سال تک اس حادثے کا ماتم کرتی رہی۔ لہٰذا طالوت کے انتخاب کے خدائی انتخاب ہونے کی اس سے بہتر کوئی علامت نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر اس میں یہ بشارت بھی مضمر تھی کہ بنی اسرائیل نے خدا کی طرف رجوع کیا ہے تو ان کی حشمت بھی اب اللہ کی مدد سے اسی طرح واپس آ جائے گی، جس طرح صندوق واپس آ گیا ہے۔

بائیبل کا بیان اس معاملے میں قرآن سے مختلف ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ فلستیوں نے طالوت کے انتخاب سے بہت پہلے ہی صندوق کو گاڑی میں رکھ کر بنی اسرائیل کے علاقے کی طرف ہانک دیا تھا۔ لیکن اس بیان کی خود بائیبل ہی کے دوسرے بیانات سے تردید ہوتی ہے۔ استاذ امام کے الفاظ میں، اگر واقعہ یہی ہے کہ فلستیوں نے سات مہینے کے بعد ہی صندوق کو اس کی کرامات اور اس کے خوارق سے ڈر کر واپس کر دیا تھا تو بائیبل کے اس بیان کے کوئی معنی نہیں رہتے:

''اور جس دن سے صندوق قریت یعریم میں رہا، تب سے ایک مدت ہو گئی، یعنی بیس برس گزرے اور اسرائیل کا سارا گھرانا خداوند کے پیچھے نوحہ کرتا رہا۔'' (سموئیل ۷: ۲)

وہ لکھتے ہیں:

''سوال یہ ہے کہ قریت یعریم اگر بنی اسرائیل ہی کے علاقے میں شامل تھا اور تابوت انھی کی حفاظت میں تھا تو بیس برس تک اسرائیل کا سارا گھرانا خداوند کے پیچھے نوحہ کیوں کرتا رہا؟ اور اس ''خداوند کے پیچھے'' کے الفاظ کا کیا مطلب ہے؟

اصل یہ ہے کہ سموئیل میں یہود نے متضاد روایات کا اتنا انبار لگا دیا ہے کہ اس کے اندر حق و باطل کا امتیاز ناممکن ہے۔ یہ قرآن کا احسان ہے کہ اس نے بعض واقعات کے صحیح پہلو نمایاں کیے۔'' (تدبر قرآن ۱/ ۵۷۶)

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اسلام، ایمان، احسان اور قیامت کی علامات

[اس روایت کی ترتیب وتدوین اور شرح ووضاحت جناب جاوید احمد غامدی کی رہنمائی میں اُن کے رفقا معز امجد، منظور الحسن، محمد اسلم نجمی اور کوکب شہزاد نے کی ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

روی[1] انه قال عبد اللّٰه بن عمر رضی اللّٰه عنهما: حدثنی ابی عمر بن الخطاب قال بینما نحن عند رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم ذات یوم[2]. اذ طلع علینا رجل[3] شدید بیاض الثیاب شدید سواد الشعر. لا یری علیه أثر السفر ولا یعرفه منا احد[4]. حتی جلس الی النبی صلی اللّٰه علیه وسلم. فاسند رکبتیه الی رکبتیه ووضع کفیه علی فخذیه[5]. وقال: یا محمد اخبرنی عن الاسلام[6]؟ فقال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: الاسلام ان تشهد ان لا اله الا اللّٰه وان محمدا رسول اللّٰه و تقیم الصلاة و توتی الزکاة وتصوم رمضان و تحج البیت ان استطعت الیه سبیلا[7]. قال: صدقت[8]. قال (عمر): فعجبنا له یساله و یصدقه.

قال: فاخبرنی عن الایمان؟ قال: ان تؤمن باللّٰه وملائکته و کتبه

ورسله واليوم الاخر وتومن بالقدر خيره و شره[9]. قال : صدقت.

قال : فاخبرنی عن الاحسان ؟ قال : ان تعبد اللّٰہ کانك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك[10].

قال : فاخبرنی عن الساعة ؟ قال : ما المسئول عنها باعلم من السائل[11]. قال : فاخبرنی عن امارتها؟ قال : ان تلد الامة ربتها وان ترى الحفاة العراة العالة رعاء الشاء يتطاولون فی البنيان[12].

قال (عمر) : ثم انطلق فلبثت مليا[13]. ثم قال لی : يا عمر ، اتدری من السائل ؟ قلت : اللّٰہ و رسوله اعلم. قال : فانه جبريل اتاكم يعلمكم دينكم.

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

روایت کیا گیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میرے والد حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ ایک دن ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے۔ (ہم نے دیکھا کہ) اس دوران میں ایک ایسا شخص نمودار ہوا جس کے کپڑے نہایت اجلے اور بال نہایت سیاہ تھے۔ نہ اس پر سفر کے کوئی آثار نظر آ رہے تھے اور نہ ہم میں سے کوئی اسے پہچانتا تھا۔ (وہ آگے بڑھا) یہاں تک کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بالکل پاس آ کر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے اپنے گھٹنے آپ کے گھٹنوں سے ملا دیے اور اپنے ہاتھ اپنے زانووں پر رکھ لیے اور آپ سے پوچھا: اے محمد، مجھے اسلام کے بارے میں بتائیے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسلام یہ ہے کہ تم اس بات کی گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور رمضان کے روزے رکھو اور بیت اللہ کا حج کرو، اگر تم اس کی استطاعت رکھتے ہو۔ اس نے (یہ جواب سنا تو) کہا: آپ نے بالکل درست فرمایا ہے۔ سیدنا عمر کا بیان ہے کہ ہمیں اس پر تعجب ہوا کہ پوچھ بھی رہا ہے اور

خود ہی (آپ کے جواب کی) تصدیق بھی کر رہا ہے۔

اس نے پھر سوال کیا: مجھے ایمان کے بارے میں بتائیے؟ آپ نے فرمایا: ایمان یہ ہے کہ تم اللہ کو مانو اور اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو مانو، اور آخرت کے دن کو مانو[2]، اور اس بات کو مانو کہ اچھے اور برے حالات اللہ پروردگار عالم ہی کی طرف سے ہوتے ہیں[3]۔ (اس پر بھی) اس نے کہا: آپ نے بالکل درست فرمایا ہے۔

پھر پوچھا: احسان کے بارے میں بتائیے؟ آپ نے جواب دیا: یہ کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو۔ اس لیے کہ اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے تو (کیا ہوا)، وہ تو بہرحال تمھیں دیکھ رہا ہے[4]۔

اس نے پوچھا: یہ بتائیے کہ قیامت کب آئے گی؟ آپ نے فرمایا: جس سے پوچھا جا رہا ہے، وہ پوچھنے والے سے زیادہ نہیں جانتا[5]۔ اس نے کہا: (اچھا)، اس کی علامتیں[6] ہی بیان کر دیجیے۔ آپ نے فرمایا: لونڈی اپنی مالکہ کو جن دے گی[7] اور تم (عرب کے) ان ننگے پاؤں، ننگے بدن بکریاں چرانے والے غریب چرواہوں کو دیکھو گے کہ عالی شان عمارتیں بنانے میں ایک دوسرے کا مقابلہ کر رہے ہیں[8]۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

عمر کہتے ہیں کہ پھر وہ شخص چلا گیا اور میں اس کے بعد بھی کچھ دیر آپ کے پاس بیٹھا رہا۔ پھر آپ نے فرمایا: عمر، جانتے ہو، یہ پوچھنے والا کون تھا؟ میں نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: یہ جبریل امین تھے[9] جو تمھیں تمھارا دین سکھانے آئے تھے۔

ترجمے کے حواشی

[1] ''اسلام'' کا لفظ جس طرح پورے دین کے لیے استعمال ہوتا ہے، اسی طرح دین کے ظاہر کو بھی بعض اوقات اسی لفظ اسلام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اپنے ظاہر کے لحاظ سے یہ انھی پانچ چیزوں سے عبارت ہے۔ یعنی توحید و رسالت کی شہادت دینا،

نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، رمضان کے روزے رکھنا اور بیت الحرام کا حج کرنا۔

[۲] ''ایمان'' دین کا باطن ہے۔ یہ انھی پانچ چیزوں سے عبارت ہے۔ یعنی اللہ پر ایمان، فرشتوں پر ایمان، نبیوں پر ایمان، کتابوں پر ایمان اور روز جزا پر ایمان۔ ایمان کے یہ اجزا قرآن میں اس طریقے سے بیان ہوئے ہیں:

''رسول اس چیز پر ایمان لایا جو اس کے پروردگار کی طرف سے اس پر اتاری گئی اور اس کے ماننے والے بھی۔ یہ سب ایمان لائے اللہ پر، اُس کے فرشتوں پر، اُس کی کتابوں اور اُس کے رسولوں پر۔ ان کا اقرار ہے کہ ہم اُس کے پیغمبروں میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔ پروردگار، ہم تیری مغفرت چاہتے اور (اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ قیامت میں ہم سب کو) تیری ہی طرف پلٹنا ہے۔'' (البقرہ ۲: ۲۸۵)

[۳] ''تقدیر کے خیر و شر پر ایمان'' ایمان باللہ ہی کی ایک فرع ہے۔

[۴] ''احسان'' کے معنی کسی کام کو اس کے بہترین طریقے پر کرنے کے ہیں۔ دین میں جب کوئی عمل اس طرح کیا جائے کہ اس کی روح اور قالب، دونوں پورے توازن کے ساتھ پیش نظر ہوں، اس کا ہر جزبہ تمام و کمال ملحوظ رہے اور اس کے دوران میں آدمی اپنے آپ کو خدا کے حضور میں سمجھے تو اسے احسان کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اور اس سے بہتر دین کس شخص کا ہو سکتا ہے جو اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دے، اس طرح کہ وہ ''احسان'' اختیار کرے اور ملت ابراہیم کی پیروی کرے جو بالکل یک سو تھا۔'' (النساء ۴: ۱۲۵)

[۵] یہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کے وقت کے بارے میں اپنی لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔ جبرئیل علیہ السلام کا قیامت کے وقت کے بارے میں سوال اسی مقصد سے ہو سکتا ہے کہ وہ لوگوں پر یہ واضح کرنا چاہتے تھے کہ اس علم غیب سے پیغمبر بھی آگاہ نہیں ہیں۔ قرآن میں کئی مقامات پر اس بات کی وضاحت کی گئی ہے۔ سورۂ اعراف میں ہے:

''وہ تم سے قیامت کے باب میں سوال کرتے ہیں کہ اس کا وقوع کب ہوگا؟ کہہ دو کہ اس کا علم تو بس میرے رب ہی کے پاس ہے۔ وہی اس کے وقت پر اس کو ظاہر کرے گا۔ آسمان و زمین اس سے بوجھل ہیں، وہ تم پر بس اچانک ہی آدھمکے گی۔ وہ تم سے پوچھتے ہیں گویا تم اس کی تحقیق کیے بیٹھے ہو۔ کہہ دو، اس کا علم تو بس اللہ ہی کے پاس ہے، لیکن اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے۔ کہہ دو، میں اپنی ذات کے لیے کسی نفع و نقصان پر کوئی اختیار نہیں رکھتا، مگر جو اللہ چاہے اور اگر میں غیب جانتا ہوتا تو خیر کا بڑا خزانہ جمع کر لیتا اور مجھے کوئی گزند نہ پہنچ پاتا۔ میں تو بس ان لوگوں کے لیے ایک ہوشیار کرنے والا اور خوش خبری دینے والا ہوں جو ایمان لائیں۔'' (۷: ۱۸۴-۱۸۸)

[۶] یہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرب قیامت کی علامتوں میں سے دو بیان فرمائی ہیں۔ قرآن و حدیث میں ان کے علاوہ بعض دوسری علامتیں بھی بیان ہوئی ہیں۔ ان میں سے بعض امور متشابہات میں سے ہیں اور بعض مجازی اور تمثیلی اسلوب میں بیان ہوئی ہیں۔ لہٰذا ان کے بارے میں یہ دو باتیں واضح رہنی چاہییں۔ ایک یہ کہ ان کے اطلاق کے بارے میں

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

قیاس تو کیا جا سکتا ہے، حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا اور دوسرے یہ کہ ان کے علم سے دین و ایمان میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔

[۷] یہ غلامی کے خاتمے کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ گویا غلامی کے بطن سے آزادی جنم لے گی۔ یعنی قیامت کے قریب یہ واقعہ رونما ہوگا کہ لونڈیوں سے جنم لینے والے بچے آزاد ہوں گے۔ یہ واقعہ ظہور پزیر ہو چکا ہے۔ ۲۵ستمبر ۱۹۲۶ کو لیگ آف نیشنز کے زیر اہتمام دنیا کی تمام اقوام نے غلامی کے خاتمے کی قرارداد پر دستخط کیے۔ اس موقع پر انھوں نے یہ طے کیا کہ اب دنیا میں انسان پر انسان کی ملکیت کا حق یکسر ختم ہو جائے گا۔

[۸] یعنی عرب میں دولت و ثروت کا یہ عالم ہوگا کہ اس زمانے کے یہ بے سروسامان اور خانہ بدوش اہل بدو عظیم الشان عمارتیں بنانے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے میں مگن ہوں گے۔ یہ واقعہ بھی حال ہی میں رونما ہوا ہے۔ عرب میں تیل نکلنے سے وہاں دولت کی بے پناہ فراوانی ہوئی۔ اہل بدو نے چراگاہوں سے اٹھ کر جدید ترین شہر آباد کر دیے اور دنیا نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جو لوگ خیموں میں بس رہے تھے، یک بہ یک فلک بوس عمارتوں میں منتقل ہو گئے ہیں اور فی الواقع بلند و بالا عمارتیں بنانے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے میں کوشاں ہیں۔

[۹] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جبریل امین اللہ کا پیغام لے کر بشری صورت میں بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے تھے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

متن کے حواشی

۱۔ اپنی اصل کے اعتبار سے یہ مسلم کی روایت، رقم ۸ ہے۔ معمولی اختلاف کے ساتھ یہ حسب ذیل مقامات پر نقل ہوئی ہے: بخاری، رقم ۴۸، ۴۴۰۴۔ مسلم، رقم ۹، ۱۰، ۱۱۔ ترمذی، رقم ۲۵۳۵۔ نسائی، رقم ۴۹۰۴، ۴۹۰۵۔ ابوداؤد، رقم ۴۰۷۵۔ ابن ماجہ، رقم ۶۲، ۶۳۔ احمد ابن حنبل، رقم ۱۷۹، ۳۴۶، ۳۵۲، ۵۷۷۵، ۵۵۹۲، ۹۱۳۷، ۱۶۵۴۱، ۱۶۸۵۱۔ ابن حبان، رقم ۱۵۹، ۱۶۸، ۱۷۳۔ ابن خزیمہ، رقم ۲۲۴۴، ۲۵۰۴۔ مسند ابوحنیفہ ۱/۱۵۲۔ بیہقی، رقم ۸۳۹۳، ۲۰۶۶۰۔ دارقطنی، رقم ۴۹۔ بن ابی شیبہ، رقم ۳۰۳۰۹، ۳۷۵۵۷، ۳۷۵۵۸۔

۲۔ بعض روایات مثلاً مسلم، رقم ۱۰ میں راوی نے بات ان الفاظ سے شروع کی ہے: 'قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم سلونی فهابوه ان یسئلوه فجاء رجل فجلس عند رکبتیه ...' (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے فرمایا کہ وہ (دینی امور کے بارے میں) سوال کریں۔ مگر لوگ سوال کرنے سے خائف تھے۔ اسی اثنا میں ایک آدمی آیا اور آپ کے زانووں کے پاس آکر بیٹھ گیا...)۔

۳۔ بعض روایات مثلاً بخاری، رقم ۴۴۹۹ میں 'اذ طلع علینا رجل' (ہمارے سامنے ایک شخص نمودار ہوا) کی جگہ 'اذ

اتاہ رجل یمشی‘(ایک شخص چلتا ہوا آپ کے پاس آیا) کے الفاظ آئے ہیں۔ جبکہ بعض روایات مثلاً بخاری، رقم ۵۰ میں ’فاتاہ جبریل فقال‘ (تو جبریل آئے اور انھوں نے کہا) کے الفاظ آئے ہیں۔

احمد ابن حنبل، رقم ۱۷۲۰۷ میں یہ بات ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے: ’جاء جبریل علیہ السلام فی غیر صورتہ یحسبہ رجلاً من المسلمین‘ (جبریل علیہ السلام اپنی اصل صورت پر نہیں آئے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھا کہ وہ مسلمانوں ہی سے کوئی فرد ہیں)۔

۴۔ بعض روایات مثلاً بخاری، رقم ۴۴۹۹ میں یہ الفاظ نقل نہیں ہوئے ہیں: ’رجل شدید بیاض الثیاب شدید سواد الشعر. لا یری علیہ أثر السفر و لا یعرفہ منا احد.‘ (ایک شخص جس کے کپڑے نہایت اجلے اور بال نہایت سیاہ تھے۔ نہ اس پر سفر کے کوئی آثار نظر آ رہے تھے اور نہ ہم میں سے کوئی اسے پہچانتا تھا)۔

بعض روایات مثلاً نسائی، رقم ۴۹۹۱ یہ اوصاف ان الفاظ میں نقل ہوئے ہیں: ’اقبل رجل احسن الناس وجھا و اطیب الناس ریحا کان ثیابہ لم یمسھا دنس.‘ (ایک نہایت خوب صورت چہرے والا اور بہترین خوشبو والا شخص آیا۔ اس کا لباس اس قدر سفید تھا کہ اسے میل نے چھوا تک نہیں تھا)۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

بعض روایات مثلاً ابن ماجہ، رقم ۶۳ میں ’شدید سواد الشعر‘ (بال نہایت سیاہ تھے) کے بجائے ’شدید سواد شعر الراس‘ (سر کے نہایت سیاہ بال) کے الفاظ آئے ہیں۔

احمد ابن حنبل، رقم ۱۸۴ میں یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں: ’جاءہ رجل یمشی حسن الوجہ حسن الشعر علیہ ثیاب بیاض فنظر القوم بعضھم الی بعض ما نعرف ھذا و ما ھذا بصاحب سفر.‘ (ایک آدمی چلتا ہوا آیا جس کا چہرہ اور بال نہایت خوب صورت تھے اور اس نے سفید کپڑے پہن رکھے تھے۔ لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ (وہ کہہ رہے تھے کہ) نہ ہم میں سے اسے کوئی جانتا تھا اور نہ وہ مسافر معلوم ہوتا تھا)۔

۵۔ بعض روایات مثلاً بخاری، رقم ۴۴۹۹ میں ’جلس الی النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم . فاسند رکبتیہ الی رکبتیہ و وضع کفیہ علی فخذیہ.‘ (وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بالکل پاس آ کر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے اپنے گھٹنے آپ کے گھٹنوں سے ملا دیے اور اپنے ہاتھ اپنے زانوؤں پر رکھ لیے) کے الفاظ نقل نہیں ہوئے۔ جبکہ بعض روایات مثلاً ترمذی، رقم ۲۶۱۰ میں ان کے بجائے ’فالزق رکبتہ برکبتہ‘ (اس نے اپنا زانو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زانو سے جوڑ دیا) کے الفاظ آئے ہیں۔ بعض روایات مثلاً نسائی، رقم ۴۹۹۱ میں یہ بیان ہوا ہے کہ وہ شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب ہونے کی اجازت طلب کرتا رہا، یہاں تک کہ وہ آپ کے بالکل قریب ہو گیا۔ الفاظ یہ ہیں: ’سلم فی طرف البساط، فقال: السلام علیک، یا محمد، فرد علیہ السلام. فقال: ادنو، یا محمد؟ قال: ادنہ. فما زال یقول ادنو

مرارا، و یقول له ادن حتی وضع یده علی رکبتی رسول الله صلی الله علیه و سلم.‘(اس نے مجلس کے کونے سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کوسلام کرتے ہوئے کہا: السلام علیکم اے محمد۔ آپ نے اس کے سلام کا جواب دیا۔ پھر اس نے پوچھا: اے محمد کیا میں آپ کے قریب ہوسکتا ہوں؟ آپ نے اسے قریب ہونے کی اجازت دی۔ مگر وہ بار بار قریب ہونے کی اجازت طلب کرتا ہے اور ہر بار آپ اسے اجازت دیتے رہے۔ یہاں تک کہ اس نے اپنے ہاتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زانووں پر رکھ دیے)۔

اس کے برعکس احمد ابن حنبل، رقم ۳۷۴ کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس شخص کو قریب ہونے کا حکم دیا۔ اس روایت کے الفاظ یہ ہیں: ’فقال رسول الله صلی الله علیه و سلم ادنه. فدنا. فقال: ادنه. فدنا. فقال: ادنه. فدنا حتی کاد رکبتاه تمسان رکبتیه.‘(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص سے فرمایا کہ وہ قریب ہو۔ وہ قریب ہوگیا۔ آپ نے پھر فرمایا کہ قریب ہو۔ وہ اور قریب ہوگیا۔ آپ نے ایک مرتبہ پھر فرمایا کہ قریب ہو۔ اس پر وہ اتنا قریب ہوگیا کہ اس کے زانو آپ کے زانووں کو چھونے لگے)۔ جبکہ احمد ابن حنبل ہی کی روایت رقم ۱۸۴ کے مطابق حضرت جبرئیل نے ان الفاظ میں آپ سے قریب ہونے کی اجازت طلب کی: ’یا رسول الله، آتیك؟‘(اے اللہ کے رسول، کیا میں آپ کے قریب آجاؤں)؟

بعض روایات مثلاً نسائی، رقم ۴۹۹۱ میں یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں: ’وضع یده علی رکبتی رسول الله صلی الله علیه و سلم.‘(اس نے اپنے ہاتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زانووں پر رکھے)۔ تاہم یہ واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ بعد کے بعض راویوں نے غلط فہمی سے ’وضع کفیه علی فخذیه‘(اس نے اپنے ہاتھ اپنے زانووں پر رکھے) میں ضمیروں کو خلط ملط کر دیا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۶۔ بعض روایات میں پہلے دو سوالوں کی ترتیب مختلف ہے۔ مثال کے طور پر بخاری، رقم ۴۴۹۹ میں سوال کرنے والے نے پہلے ایمان اور پھر اسلام کے بارے میں سوال کیا ہے۔ اسی طرح سوال کے الفاظ میں بھی کچھ فرق ہے۔ مثلاً بخاری، رقم ۴۴۹۹ میں سوالات کا اسلوب یہ ہے: ’ما الایمان؟‘(ایمان کیا ہے)؟ ’ما الاسلام؟‘(اسلام کیا ہے؟) ’ما الاحسان؟‘(احسان کیا ہے)؟ ’متی الساعة؟‘(قیامت کب آئے گی)؟ جبکہ احمد ابن حنبل، رقم ۲۹۲۶ میں سوالوں کا اسلوب یہ ہے: ’حدثنی ما الایمان؟‘(مجھے بیان فرمائیے کہ ایمان کیا ہے)؟ ’حدثنی ما الاسلام؟‘(مجھے بیان فرمائیے کہ اسلام کیا ہے)؟ ’حدثنی ما الاحسان؟‘(مجھے بیان فرمائیے کہ احسان کیا ہے)؟ ’حدثنی متی الساعة؟‘(مجھے بیان فرمائیے کہ قیامت کب آئے گی)؟

۷۔ بعض روایات مثلاً بخاری، رقم ۴۴۹۹ میں اسلام کے بارے میں سوال کا جواب ان الفاظ میں نقل ہوا ہے: ’ان تعبد

اللّٰـه و لا تشرك بـه شيئـا و تقيم الصلاة و تؤتی الزكاة المفروضة و تصوم رمضان '(یہ کہ تم اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور نماز قائم کرو اور فرض زکوٰۃ ادا کرو اور رمضان کے روزے رکھو)۔

بعض روایات مثلاً مسلم، رقم ۹ میں 'و تقیم الصلاة '(نماز قائم کرو) کی جگہ 'و تقیم الصلاة المكتوبة '(فرض نماز قائم کرو) کے الفاظ آئے ہیں، اور 'و تـودی الزكاة '(اور زکوٰۃ ادا کرو) کا جملہ 'و تـودی الـزكاة المفروضة '(اور فرض زکوٰۃ ادا کرو) کی صورت میں روایت ہوا ہے۔

بعض روایات مثلاً مسلم، رقم ۹ میں 'و تـحـج البيت ان استطعت اليه سبيلا '(اور بیت اللہ کا حج کرو، اگر تم اس کے لیے سفر کی استطاعت رکھتے ہو) کے الفاظ نقل نہیں ہوئے۔ جبکہ بعض روایات مثلاً نسائی، رقم ۴۹۹۱ میں 'ان اسـتـطـعـت اليـــه سبيـلا '(اگر تم اس کے لیے سفر کی استطاعت رکھتے ہو) کے الفاظ درج نہیں ہیں۔ جبکہ کچھ روایات مثلاً بیہقی، رقم ۲۰۶۶۰ میں یہی بات ان الفاظ میں آئی ہے: 'ان استطعت السبيل '(اگر تم اس کے لیے سفر کی استطاعت رکھتے ہو)۔

بعض روایات مثلاً مسلم، رقم ۱۰ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں: 'لا تشـرك بـالـلّٰـه شيئا و تقيم الصلاة و تؤتی الزكوٰة و تصوم رمضان '(اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور رمضان کے روزے رکھو)۔

بعض روایات مثلاً ترمذی، رقم ۲۶۱۰ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں: 'شهـادة ان لا اله الا اللّٰه و ان مـحـمـدا عبـده و رسـوله و اقام الصلاة و ايتا الزكاة و حج البيت و صوم رمضان '(اس بات کی شہادت کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے اور محمد اللہ کے بندے اور رسول ہیں اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ ادا کرنا اور بیت اللہ کا حج اور رمضان کے روزے)۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

بعض روایات مثلاً ابن ماجہ، رقم ۶۳ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ الفاظ روایت ہوئے ہیں: 'شهـادة ان لا الـه الا اللّٰه و انی رسول اللّٰه '(اس بات کی شہادت کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے اور میں اللہ کا رسول ہوں)۔

ابوداؤد، رقم ۴۶۹۷ میں اضافی طور پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ الفاظ بھی روایت ہوئے ہیں: 'الاغتسال من الجنابة' (غسل جنابت)۔

احمد ابن حنبل، رقم ۳۷۴ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ الفاظ روایت ہوئے ہیں: 'اقام الصلاة و ايتا الزكاة و حج البيـت و صيـام شهر رمضان و غسل من الجنابة كل ذلك '(نماز کا قیام اور زکوٰۃ کی ادائیگی اور بیت اللہ کا حج اور ماہ رمضان کے روزے اور غسل جنابت، یہ سب کچھ اسلام ہے)۔

احمد ابن حنبل، رقم ۲۹۲۶ میں یہ الفاظ روایت ہوئے ہیں: 'الا سـلام ان تسـلم و جهك للّٰه و ان تشهد لا اله

الا اللّٰہ وحدہ لا شریك له وان محمدا عبدہ ورسولہ '(اسلام یہ ہے کہ تو اپنے آپ کو اللہ کے سامنے جھکا دے اور یہ کہ تو شہادت دے کہ اللہ کے سوا کوئی الہٰ نہیں ہے اور وہ تنہا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور یہ کہ محمد اس کے بندے اور رسول ہیں)۔

ابن حبان، رقم ۱۷۳ میں یہ الفاظ اضافی طور پر نقل ہوئے ہیں: 'وتعتمر وتغسل من الجنابت و ان تتم الوضوء '(اور تو عمرہ ادا کرے اور غسل جنابت کرے اور یہ کہ وضو کرے)۔

احمد ابن حنبل، رقم ۳۷۴ کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جواب سننے کے بعد سوال کرنے والے نے جس اسلوب میں توثیق کی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہایت تعظیم کے ساتھ آپ سے مخاطب ہو رہا تھا۔ روایت کے الفاظ ہیں: 'قال القوم ما رأینا رجلا أشد توقیرا لرسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من ھذا، کانہ یعلم رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم '(لوگوں نے کہا کہ ہم نے اس شخص سے زیادہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کرنے والا شخص نہیں دیکھا۔ گویا کہ وہ آپ کو پوری طرح جانتا تھا)۔

بعض روایات مثلاً نسائی، رقم ۴۹۹۱ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کے بعد یہ مکالمہ نقل ہوا ہے کہ جبرئیل علیہ السلام نے پوچھا: 'اذا فعلت ذلك فقد اسلمت؟ '(اگر میں یہ کروں تو کیا میرا اسلام مکمل ہو گیا)؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: 'نعم '(ہاں)۔ احمد ابن حنبل، رقم ۲۹۲۴ کے مطابق اس موقع پر جبرئیل علیہ السلام کا سوال ان الفاظ میں تھا: 'فاذا فعلت ذلك فانا مسلم؟ '(اگر میں یہ کروں تو کیا میں مسلمان ہو جاؤں گا)؟ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کے الفاظ یہ تھے: 'اذا فعلت ذلك فقد اسلمت؟ '(اگر تو یہ کرے گا تو تو اسلام میں داخل ہو جائے گا)؟

۸۔ بعض روایات مثلاً مسلم، رقم ۹ میں سوال کرنے والے کی طرف سے 'صدقت '(آپ نے بالکل درست فرمایا) کے تصدیقی الفاظ نقل نہیں ہوئے۔

۹۔ بعض روایات مثلاً بخاری، رقم ۴۴۹۹ میں ایمان کے بارے میں سوال کا جواب ان الفاظ میں نقل ہوا ہے: 'ان تومن باللّٰہ و ملائکته و کتبه و رسله و لقائه و تؤمن بالبعث الاخر '(اور یہ کہ تو ایمان لائے اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس سے ملنے پر اور آخرت میں زندہ ہونے پر) یہاں 'بالقدر خیرہ و شرہ '(تقدیر کے خیر و شر پر) کے الفاظ نقل نہیں ہوئے، جبکہ 'ولقائه '(اور اس سے ملنے پر) کے الفاظ اضافی طور پر نقل ہوئے ہیں۔ بعض روایتوں مثلاً بخاری، رقم ۵۰ میں 'بالبعث الاخر '(آخرت میں زندہ ہونے پر) کے الفاظ 'الاخر '(آخرت) کے لفظ کے بغیر نقل ہوئے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بعض روایات مثلاً مسلم، رقم ۹ میں 'کتبہ' (اس کی کتابوں) کے بجائے 'کتابہ' (اس کی کتاب) کے الفاظ آئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً مسلم، رقم ۱۰ میں 'و تؤمن بالقدر خیرہ و شرہ' (اور تو اچھے اور برے حالات کے اللہ کی طرف سے ہونے پر ایمان لائے) کے الفاظ اس طریقے سے روایت ہوئے ہیں: 'و تؤمن بالقدر کلہ' (اور تو تقدیر کے ہر معاملے پر ایمان لائے)۔ جبکہ بعض روایات مثلاً نسائی، رقم ۴۹۹۰ میں اس بات کے لیے 'ولقدر خیرہ و شرہ حلوہ و مرہ' (اور تقدیر کے خیر و شر اور تلخ و شیریں پر) کا جملہ نقل ہوا ہے۔ اس کے برعکس بعض روایات مثلاً ابن حبان، رقم ۱۵۹ میں 'والقدر خیرہ و شرہ' (اور تقدیر کا خیر و شر) کے الفاظ نقل نہیں ہوئے۔

بعض روایات مثلاً احمد ابن حنبل، رقم ۱۸۴ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ الفاظ روایت ہوئے ہیں: 'ان تؤمن باللّٰہ و ملائکتہ والجنۃ والنار والبعث بعد الموت والقدر کلہ' (یہ کہ تو ایمان لائے اللہ پر اور فرشتوں پر اور جنت و دوزخ پر اور مرنے کے بعد اٹھنے پر اور تقدیر کے ہر معاملے پر)۔

احمد ابن حنبل، رقم ۲۹۲۶ کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ یہ ہیں: 'الایمان ان تؤمن باللّٰہ والیوم الاخر والملائکۃ والکتاب والنبیین، وتؤمن بالموت وبالحیاۃ بعد الموت، وتؤمن بالجنۃ والنار والحساب والمیزان، وتومن بالقدر کلہ خیرہ و شرہ' (ایمان یہ ہے کہ تو ایمان لائے اللہ پر، یوم آخرت پر، فرشتوں پر، کتاب پر اور نبیوں پر اور ایمان لائے موت پر اور موت کے بعد زندگی پر اور ایمان لائے جنت و دوزخ پر اور حساب اور میزان پر اور ایمان لائے اچھے اور برے حالات کے اللہ کی طرف سے ہونے پر)۔

بعض روایات مثلاً نسائی، رقم ۴۹۹۱ کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کے بعد جبرئیل علیہ السلام سے یہ سوال بھی نقل ہوا ہے: 'اذا فعلت ذلك فقد امنت؟' (جب میں یہ کروں گا تو کیا میرا ایمان مکمل ہو گیا)؟ اس کے جواب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے 'نعم' (ہاں) کا لفظ روایت ہوا ہے۔ جبکہ احمد ابن حنبل، رقم ۲۹۲۶ میں 'اذا فعلت ذلك فقد امنت' (جب تو یہ کرے گا تو ایمان اختیار کرے گا) کے الفاظ آئے ہیں۔ اسی طرح احمد ابن حنبل، رقم ۵۸۵۶ میں 'فاذا فعلت ذلك فانا مومن؟' (جب میں یہ کروں گا تو کیا مومن ہوں گا)؟ کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔

۱۰۔ بعض روایات مثلاً مسلم، رقم ۹ میں احسان کے بارے میں سوال کا جواب ان الفاظ میں نقل ہوا ہے: 'ان تعبد اللّٰہ کانك تراہ، فانك ان لا تراہ، فانہ یراك.' (یہ کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو۔ اس لیے کہ اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے تو (کیا ہوا)، وہ تو بہر حال تمھیں دیکھ رہا ہے)۔

بعض روایات مثلاً مسلم، رقم ۱۰ میں یہ بات ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے: 'تخشی اللّٰہ، کانك تراہ، فانك ان لا تکن تراہ، فانہ یراك.' (تم اللہ سے اس طرح ڈرو کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو۔ اس لیے کہ اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے تو

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

وہ تو بہر حال تمھیں دیکھ رہا ہے)۔

بعض روایات مثلاً احمد ابن حنبل، رقم ۱۸۴ میں اس ضمن میں 'ان تعمل للّٰہ ، کانک تراہ ، فان لم تکن تراہ ، فانہ یراک'. (تم اللہ کے لیے اس طرح عمل کرو کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو۔ اس لیے کہ اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے تو وہ تو بہر حال تمھیں دیکھ رہا ہے۔) یہی جواب احمد ابن حنبل، رقم ۲۹۲۶ میں 'فان لم تراہ' (اس لیے کہ اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے) کے الفاظ کے بغیر نقل ہوا ہے۔

بعض روایات مثلاً احمد ابن حنبل، رقم ۱۷۲۰۷ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ الفاظ روایت ہوئے ہیں: 'ان تعبد اللّٰہ ، کانک تراہ ، فانک ان کنت لا تراہ ، فھو یراک .' (یہ کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو۔ اس لیے کہ اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے تو (کیا ہوا)، وہ تو بہر حال تمھیں دیکھ رہا ہے)۔

بعض روایات مثلاً احمد ابن حنبل، رقم ۵۸۵۶ میں یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں: 'تخشی اللّٰہ تعالیٰ ، کانک تراہ ، فان لا تک تراہ فانہ یراک'. (تم اللہ سے اس طرح ڈرو کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو۔ اس لیے کہ اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے تو وہ تو تمھیں دیکھ رہا ہے)۔

بعض روایات مثلاً احمد ابن حنبل، رقم ۵۸۵۶ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کے بعد یہ مکالمہ نقل ہوا ہے کہ جبرئیل علیہ السلام نے پوچھا: 'فاذا فعلت ذلک ، فانا محسن ؟' (اگر میں یہ کروں تو کیا میں محسن ہو جاؤں گا)؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: 'نعم' (ہاں)۔ معمولی فرق کے ساتھ احمد ابن حنبل، رقم ۱۷۲۰۷ میں یہ سوال اس طرح نقل ہوا ہے: 'فاذا فعلت ذلک، فقد احسنت ؟' (اگر میں نے ایسا کیا تو کیا میں نے احسان اختیار کیا)؟

۱۱۔ بعض روایات مثلاً احمد ابن حنبل، رقم ۵۸۵۶ میں قیامت اور اس کی علامات کے بارے میں سوال نقل ہی نہیں ہوا۔

بعض روایات مثلاً نسائی، رقم ۴۹۹۱ کے مطابق جب جبرئیل علیہ السلام نے قیامت کے وقت کے بارے میں سوال کیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا سر جھکا لیا اور کوئی جواب نہ دیا۔ انھوں نے دوبارہ پوچھا تو آپ نے پھر بھی جواب نہ دیا۔ پھر تیسری مرتبہ انھوں نے اپنا سوال دہرایا تو اس بار بھی آپ خاموش رہے۔ بالآخر آپ نے فرمایا کہ جس سے پوچھا جا رہا ہے، وہ پوچھنے والے سے زیادہ نہیں جانتا۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں: 'قال : یا محمد، اخبرنی متی الساعۃ؟ قال: فنکس، فلم یجبہ شیئا، ثم اعاد فلم یجبہ شیئا، ثم اعاد فلم یجبہ شیئا، ورفع راسہ، فقال : ماالمسئول عنھا باعلم من السائل .' (اس نے پوچھا: اے محمد، مجھے بتائیے کہ قیامت کب آئے گی؟ راوی کا کہنا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا سر جھکا لیا اور کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے سوال دہرایا تو آپ پھر خاموش رہے۔ اس نے پھر پوچھا تو اس بار بھی آپ خاموش رہے۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا سر اٹھایا اور فرمایا: جس سے پوچھا جا رہا ہے، وہ پوچھنے والے

سے زیادہ نہیں جانتا)۔

احمد ابن حنبل، رقم ۲۹۲۶ کے مطابق قیامت کے بارے میں سوال کے جواب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ یہ تھے: 'سبحان اللّٰہ، فی خمس من الغیب، لا یعلمھن الا ھو، ان اللّٰہ عندہ علم الساعة، و یترل الغیث و یعلم ما فی الارحام، و ما تدری نفس ماذا تکسب غدا، و ما تدری نفس بای ارض تموت، ان اللّٰہ علیم خبیر.'(اللہ ہر خطا سے پاک ہے۔غیب کی ان پانچ چیزوں کے بارے میں وہ جانتا ہے۔ بے شک اللہ ہی کے پاس قیامت کا علم ہے۔ وہ بارش برساتا ہے (اور کوئی نہیں جانتا کہ کب برسائے گا) اور جو کچھ رحموں میں ہے اُسے جانتا ہے (اور تم میں سے کوئی اُس سے واقف نہیں ہوتا) اور کوئی نہیں جانتا کہ اس نے اگلے روز کیا کمانا ہے اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ اس نے کس جگہ مرنا ہے۔ بے شک، اللہ علیم و خبیر ہے)۔

۱۲۔ بخاری، رقم ۴۴۹۹ کے مطابق قیامت کی علامات کے بارے میں سوال ہی نہیں کیا گیا، بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ازخود علامات قیامت بھی بیان فرما دیں۔

بعض روایات مثلاً بخاری، رقم ۴۴۹۹ میں پہلی علامت اس طرح بیان ہوئی ہے:'اذا ولدت المراة ربتها فذاك من اشراطها'(جب یہ عورت اپنی مالکہ کو جن دے گی تو یہ اس کی علامات میں سے ہے)۔

بعض روایات مثلاً بخاری، رقم ۵۰ میں یہ بات 'اذا ولدت الامة ربھا '(جب لونڈی اپنے مالک کو جن دے گی) کے الفاظ میں نقل ہوئی ہے۔ بعض روایات مثلاً مسلم، رقم ۱۰ میں 'اذا رایت المراة تلد ربتھا '(جب تو دیکھے کہ لونڈی اپنی مالکہ کو جن دے) کا جملہ درج ہے، جبکہ احمد ابن حنبل، رقم ۱۸۴ میں یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں: 'و ولدت الاماء رباتھن. ' (اور یہ لونڈیاں اپنی مالکاؤں کو جنیں گی)۔

بعض روایات مثلاً بخاری، رقم ۴۴۹۹ میں دوسری علامت ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے:'کان الحفاة العراة رؤوس الناس فذاك من اشراطها.'(اور تم ان ننگے پاؤں، ننگے بدن والوں کو لوگوں کے حکمران دیکھو گے)۔

بعض روایات مثلاً بخاری، رقم ۵۰ میں یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں:'و اذا تطاول رعاة الابل البھم فی البنیان.'(اور جب تم اونٹوں کے ان گونگے چرواہوں کو دیکھو گے کہ عالی شان عمارتیں بنانے میں ایک دوسرے کا مقابلہ کر رہے ہیں)۔

احمد ابن حنبل، رقم ۱۷۰۷ میں اس سلسلے میں یہ الفاظ آئے ہیں:'و یطول اھل البنیان بالبنیان، و کان العالة الحفاة رؤوس الناس .'(عمارتیں بنانے والے عالی شان عمارتیں بنائیں گے اور یہ مفلس اور گنوار افراد لوگوں کے حکمران ہوں گے)۔

بعض روایات مثلاً مسلم، رقم ۹ میں دو کے بجائے تین علامتیں بیان ہوئی ہیں۔ روایت کے الفاظ ہیں:'اذا ولدت الامة

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ربھا ، فذاك من اشراطھا ، واذا كانت العراة الحفاة رؤوس الناس ، فذاك من اشراطھا ، واذا تطاول رعاء البھم فی البنیان ، فذاك من اشراطھا '(جب لونڈی اپنے مالک کو جن دے گی تو یہ اس کی علامات میں سے ہے۔اور جب یہ ننگے بدن اور ننگے پاؤں والے افراد لوگوں کے حکمران ہوں گے تو یہ اس کی علامات میں سے ہے اور جب مویشیوں کے چرواہے عالی شان عمارتیں بنانے میں ایک دوسرے کا مقابلہ کریں گے تو یہ اس کی علامات میں سے ہے)۔

مسلم،رقم ۱۰ میں بھی یہی اسلوب بیان ہے،تاہم وہاں دوسری علامت کے لیے 'واذا رایت الحفاة العراة الصم البكم ملوك الارض '(اور جب تم ان ننگے پاؤں، ننگے بدن والے گونگے اور بہرے لوگوں کو زمین کے حکمران دیکھو گے) کے الفاظ نقل ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً احمد ابن حنبل،رقم ۲۹۲۶ میں 'الحفاة العراة العالة '(ننگے پاؤں ننگے بدن والے غریب) کے ساتھ 'الجیاع '(بھوکے) کا لفظ بھی آیا ہے۔جبکہ احمد ابن حنبل،رقم ۹۴۹۷ میں لفظ 'الجفاة' (گنوار) کا اضافہ ہے۔

احمد ابن حنبل،رقم ۲۹۲۶ میں سوال کرنے والے کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں: 'یا رسول اللّٰہ ومن اصحاب الشاء والحفاة والجیاع العالة ؟'(اے اللہ کے رسول یہ چرواہے،یہ ننگے پاؤں والے بھوکے کون ہیں)؟اس کے جواب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے 'العرب '(عرب) کا لفظ نقل ہوا ہے۔جبکہ احمد ابن حنبل،رقم ۱۷۲۰۷ میں اس مقام پر 'العریب '(عرب) کا لفظ درج ہے۔

بعض روایات مثلاً نسائی،رقم ۴۹۹۱ میں ان علامات کی ترتیب مختلف ہے۔

احمد ابن حنبل،رقم ۱۷۲۰۷ کے مطابق جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کرنے والے کو یہ بتایا کہ قیامت کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بجائے سوال کرنے والے ہی نے قیامت کی بعض علامات سے آگاہ کیا:

یا رسول اللّٰہ، ان شئت حدثتك بعلامتین تكونان قبلھا. فقال: حدثنی. فقال: اذا رایت الامة تلد ربھا، ویطول اھل البنیان بالبنیان، وعاد العالة الحفاة رؤوس الناس . قال: ومن اولئك یا رسول اللّٰہ؟ قال: العریب.	''اے اللہ کے رسول،اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو دو ایسی علامتیں بتاؤں جو قیامت سے پہلے ظاہر ہوں گی۔آپ نے فرمایا: ہاں مجھے بتائیں۔ اس نے کہا: جب آپ دیکھیں کہ لونڈی نے اپنے مالک کو جنا ہے اور عمارتیں بنانے والے عالی شان عمارتیں بنا رہے ہیں اور یہ گنوار اور ننگے پاؤں والے افراد لوگوں کے حکمران ہو گئے ہیں۔کسی نے پوچھا: اے اللہ کے رسول، یہ کون لوگ ہیں؟ آپ نے جواب دیا:عرب''۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

بعض روایات مثلاً بخاری، رقم ۴۴۹۹ میں قیامت کی علامات نقل کرنے کے بعد راوی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت واضح کیے بغیر یہ جملہ نقل کیا ہے:'فی خمس لا یعلمهن الا اللّٰه، ان اللّٰه عنده علم الساعة، و ینزل الغیث و یعلم ما فی الارحام'(ان پانچ چیزوں کے بارے میں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بے شک اللہ ہی کے پاس قیامت کا علم ہے۔ وہ بارش برساتا ہے (اور کوئی نہیں جانتا کہ کب برسا دے گا) اور جو کچھ رحموں میں ہے، اسے جانتا ہے (اور تم میں سے کوئی اس سے واقف نہیں ہوتا)۔ تاہم بعض روایات مثلاً بخاری، رقم ۵۰ میں یہ الفاظ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے منسوب کیے گئے ہیں۔ مسلم، رقم ۹ میں اس بات پر ان الفاظ کا اضافہ بھی موجود ہے:'و ما تدری نفس ماذا تکسب غدا، و ما تدری نفس بای ارض تموت'(کوئی شخص نہیں جانتا کہ اس نے اگلے روز کیا کمانا ہے اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ اس نے کس جگہ مرنا ہے)۔

۱۳۔ بعض روایات مثلاً نسائی، رقم ۴۹۹۱ کے مطابق آنے والے شخص نے رخصت ہونے سے پہلے یہ الفاظ کہے:'لا، و الذی بعث محمدا بالحق هدی و بشیرا، ما کنت باعلم به من رجل منکم'(نہیں، اس ذات کی قسم جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ رہنما اور بشارت دینے والا بنا کر بھیجا، میں اس کے بارے میں تم میں سے کسی شخص سے زیادہ واقف نہیں ہوں)۔

بعض روایات مثلاً ترمذی، رقم ۲۶۱۰ میں قال: ثم انطلق، فلبثت ملیا، ثم قال لی: یا عمر اتدری من السائل؟'(عمر کہتے ہیں کہ پھر وہ شخص چلا گیا اور میں اس کے بعد بھی کچھ دیر آپ کے پاس بیٹھا رہا۔ پھر آپ نے فرمایا: عمر، جانتے ہو، یہ پوچھنے والا کون تھا؟) کے بجائے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں:'قال عمر: فلقینی النبی صلی اللّٰه علیه و سلم بعد ذلك بثلاث، فقال: یا عمر هل تدری من السائل؟'(عمر کہتے ہیں: تین روز بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے میری ملاقات ہوئی۔ پھر آپ نے فرمایا: عمر، جانتے ہو، یہ پوچھنے والا کون تھا)؟ جبکہ بعض روایات مثلاً نسائی، رقم ۴۹۹۰ میں یہ بات ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے:'قال عمر: فلبثت ثلاثا ثم قال لی رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و سلم: یا عمر هل تدری من السائل؟'(عمر کہتے ہیں: تین روز گزر گئے۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا: عمر، جانتے ہو، یہ پوچھنے والا کون تھا)؟

بعض روایات مثلاً بخاری، رقم ۴۴۹۹ کے مطابق اس شخص کے چلے جانے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے کہا کہ اسے واپس بلا کر لائیں۔ مگر لوگ اسے تلاش نہ کر سکے۔ اس موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ جبرئیل علیہ السلام تھے جو لوگوں کو دین کے بعض پہلو سکھانے کے لیے آئے تھے۔ روایت کے الفاظ ہیں:'ثم انصرف الرجل. فقال: ردوا علی. فاخذوا لیردوا، فلم یروا شیئا، فقال: هذا جبریل جاء لیعلم الناس دینهم'(پھر وہ شخص چلا

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

گیا۔ پھر آپ نے فرمایا: اسے میرے پاس واپس لاؤ۔ لوگ اس کی تلاش میں نکلے، مگر اس کا کوئی نشان نہ پا سکے۔ پھر آپ نے فرمایا: یہ جبریل امین تھے جو لوگوں کو ان کے دین کی تعلیم دینے آئے تھے۔) جبکہ بعض روایات مثلاً ترمذی، رقم ۲۶۱۰ میں 'ذاك جبريل اتاكم يعلمكم معالم دينكم.' (یہ جبریل امین تھے جو تمھیں دین کے بعض اہم پہلو سمجھانے آئے تھے۔) بعض روایات مثلاً نسائی، رقم ۴۹۹۰ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے 'فانه جبريل عليه السلام، اتاكم ليعلمكم امر دينكم.' (یہ جبریل تھے جو تمھارے پاس تمھیں دین کا معاملہ سمجھانے آئے تھے)۔

بعض روایات مثلاً مسلم، رقم ۱۰ میں نقل ہوا ہے کہ جب لوگ اس شخص کے بغیر آپ کے پاس واپس پہنچے تو آپ نے فرمایا: 'هذا جبريل اراد ان تعلموا اذا لم تسئلوا.' (یہ جبریل تھے، جب تم سوال نہیں کر رہے تھے تو انھوں نے چاہا کہ تمھیں سکھا دیں)۔ احمد ابن حنبل، رقم ۱۸۴ میں جبرئیل علیہ السلام کے جانے کے بعد یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں: 'قال: على الرجل، فطلبوه فلم يروا شيئا فمكث يومين او ثلاثة.' (نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس شخص کو میرے پاس واپس لاؤ۔ لوگوں نے اسے تلاش کرنا شروع کیا، مگر تلاش نہ کر سکے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دو یا تین دن تک انتظار کیا)۔

بعض روایات مثلاً نسائی، رقم ۴۹۹۱ میں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ جبرئیل علیہ السلام ایک صحابی دحیہ کلبی کی صورت میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ اس کے برعکس احمد ابن حنبل کی روایت رقم ۳۷۴ کے الفاظ یہ ہیں: 'هذا جبريل جاء كم يعلمكم دينكم ما اتاني في صورة الا عرفته غير هذه الصورة.' (یہ جبریل تھے جو تمھیں تمھارا دین سکھانے کے لیے آئے تھے۔ اس موقع کے سوا یہ جس صورت میں بھی آئے ہیں، میں نے انھیں پہچان لیا ہے)۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

''حکمران کا بگاڑ ہمیشہ عوام کے بگاڑ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ جیسے تم ہو گے ویسے ہی تمھارے حکمران ہوں گے۔ ایسی حالت میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ جب حکمران میں بگاڑ نظر آئے تو عوام کی سطح پر اصلاح کا کام شروع کر دیا جائے۔ درخت کے اندر اگر سوکھنے کے آثار ظاہر ہوں تو اس کی جڑ میں پانی دیا جائے گا نہ کہ پتیوں میں۔ سیاست میں بگاڑ کو دیکھ کر سیاسی نظام سے لڑنے لگنا صرف ایک عاجلانہ ردعمل ہے، قوت کے ضیاع کے سوا اس کا کوئی حقیقی فائدہ نہیں۔ اس لیے اسلام میں ایسی کارروائیوں سے منع کیا گیا ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ بگاڑ کی جڑ کو سمجھا جائے اور جڑ سے اصلاح کی کوشش کی جائے۔ اور جڑ والی اصلاح کا آغاز عوامی اصلاح سے ہوتا ہے نہ کہ حکومتی ٹکراؤ سے۔''

(مولانا وحید الدین خان، تصویر ملت ۱۶۶)

قانون معیشت

[یہ ''میزان'' کا ایک باب ہے۔نئی طباعت کے لیے مصنف نے اس میں بعض اہم ترامیم کی ہیں۔ یہ پوراباب ان ترامیم کے ساتھ ہم یہاں شائع کر رہے ہیں۔]

تزکیۂ معیشت کا جوقانون اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغمبر کی وساطت سے انسانیت کو دیا ہے،اس کی بنااس اصول پر قائم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا آزمایش کے لیے بنائی ہے۔اسی وجہ سے اس کا نظام اس نے اس طرح قائم کیا ہے کہ یہاں سب لوگ ایک دوسرے کے محتاج اور محتاج الیہ کی حیثیت سے پیدا ہوئے ہیں۔اس دنیا میں اعلیٰ سے اعلیٰ شخصیتیں بھی اپنی ضرورتوں کے لیے دوسروں کی طرف رجوع کی محتاج ہیں اور ادنیٰ سے ادنیٰ انسانوں کی طرف بھی ان ضرورتوں کے لیے رجوع کیا جاتا ہے۔ یہاں ہر شخص کا ایک کردار ہے اور کوئی بھی دوسروں سے بے نیاز ہو کر زندہ نہیں رہ سکتا۔عالم کے پروردگار نے یہاں ہر شخص کی ذہانت ،صلاحیت ،ذوق و رجحان اور ذرائع و وسائل میں بڑا تفاوت رکھا ہے۔ چنانچہ اس تفاوت کے نتیجے میں جو معاشرہ وجود میں آتا ہے،اس میں اگر ایک طرف وہ عالم اور حکیم پیدا ہوتے ہیں جن کی دانش سے دنیا روشنی حاصل کرتی ہے؛ وہ مصنف پیدا ہوتے ہیں جن کا قلم لفظ و معنی کے رشتوں کو حیاتِ ابدی عطا کرتا ہے؛ وہ محقق پیدا ہوتے ہیں جن کے نوادرِ تحقیق پر زمانہ داد دیتا ہے؛ وہ لیڈر پیدا ہوتے ہیں جن کی تدبیر و سیاست سے حیاتِ اجتماعی کے عقدے کھلتے ہیں؛ وہ مصلح پیدا ہوتے ہیں جن کی سعی و جہد سے انسانیت خود اپنا شعور حاصل کرتی ہے اور وہ حکمران پیدا ہوتے ہیں جن کا عزم و استقلال تاریخ کا رخ بدل دیتا ہے تو دوسری طرف وہ مزدور اور دہقان اور وہ خادم اور قلی اور خاک روب بھی پیدا ہوتے ہیں جن کی محنت سے کلیں معجزے دکھاتی ،مٹی سونا اگلتی ،چولھے لذتِ کام و دہن کا سامان پیدا کرتے ،گھر چاندی کی طرح چمکتے ،راستے پاؤں لینے کے لیے بے تاب نظر آتے ،عمارتیں آسمان کی خبر لاتی اور غلاظتیں صبح دم اپنا بستر سمیٹ لیتی ہیں۔قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي ''اس حیاتِ دنیوی میں ان کا سامانِ معیشت تو ہم نے

الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ رَفَعْنَا بَعْضَھُم فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَتَّخِذَ بَعْضُھُمْ بَعْضًا سُخْرِیًّا، وَ رَحْمَتُ رَبِّكَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ۔ (الزخرف۴۳: ۳۲)

تقسیم کیا ہے اور (اس طرح تقسیم کیا ہے کہ) ایک کا مرتبہ دوسرے سے بلند رکھا ہے تاکہ وہ ایک دوسرے سے کام لے سکیں۔ اور تیرے پروردگار کی رحمت اس سے بہتر ہے جو یہ سمیٹ رہے ہیں۔''

اس فرقِ مراتب کے ساتھ دنیا کو پیدا کر کے عالم کا پروردگار یہ دیکھ رہا ہے کہ یہ اعلیٰ و ادنیٰ، باہمی احترام اور باہم دگر تعاون سے صالح معاشرت اور صالح تمدن وجود میں لاتے ہیں یا ایک دوسرے کے خلاف اپنی شرارتوں اور حماقتوں سے اس عالم کو سراسر فساد بنا دینے کی سعی میں مصروف ہو جاتے ہیں، اور اس طرح دنیا میں بھی رسوا ہوتے اور آخرت میں بھی اس کے عذاب کے مستحق ٹھیرتے ہیں۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَ نَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَ الْخَیْرِ فِتْنَةً، وَاِلَیْنَا تُرْجَعُوْنَ۔ (الانبیاء۲۱: ۳۵)

''اور ہم تمھیں دکھ سکھ سے آزما رہے ہیں، پرکھنے کے لیے، اور تم ہماری ہی طرف لوٹائے جاؤ گے۔''

انسان کی یہی آزمایش ہے جس میں پورا اترنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے اس کی رہنمائی فرمائی اور معاشی عمل میں اس کے تزکیہ و تطہیر کے لیے اسے اپنا قانون دیا ہے۔

اس قانون کا خلاصہ درج ذیل ہے:

۱۔ مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اگر صاحبِ نصاب ہوں تو اپنے مال، مواشی اور پیداوار میں سے شریعت کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق زکوٰۃ ادا کریں۔

۲۔ مسلمان یہ زکوٰۃ ادا کر دیں تو ان کا وہ مال جس کے وہ جائز طریقوں سے مالک ہوئے ہیں، اللہ و رسول کی طرف سے مقرر کسی حق کے بغیر ان سے چھینا نہیں جا سکتا، یہاں تک کہ اسلامی ریاست اس زکوٰۃ کے علاوہ اپنے مسلمان شہریوں پر کسی نوعیت کا کوئی ٹیکس بھی عائد نہیں کر سکتی۔

۳۔ دولت کی منصفانہ تقسیم کے لیے قومی شعبے کا قیام ناگزیر ہے، لہٰذا وہ تمام اموال اور املاک جو کسی فرد کی ملکیت نہیں ہیں یا نہیں ہو سکتے، انھیں ہر حال میں ریاست ہی کی ملکیت رہنا چاہیے۔

۴۔ کوئی شخص اگر اپنے املاک میں تصرف کی اہلیت نہ رکھتا ہو تو ضروری ہے کہ اس کی ملکیت قائم رکھتے ہوئے ان میں تصرف سے اسے معزول کر دیا جائے۔

۵۔ دوسروں کا مال باطل طریقوں سے کھانا ممنوع ہے۔ سود اور جوا اس سلسلے کے بدترین جرائم ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے تمام معاشی معاملات کے جواز اور عدمِ جواز کا فیصلہ بھی اسی اصول کی روشنی میں کرنا چاہیے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۶۔لین دین، قرض، وصیت اور اس طرح کے دوسرے مالی امور میں تحریر وشہادت کا اہتمام ضروری ہے۔اس سے بے پروائی بعض اوقات بڑے اخلاقی فساد کا باعث بن جاتی ہے۔

۷۔ہر مسلمان کی دولت اس کے مرنے کے بعد لازماً درجِ ذیل طریقے سے اس کے وارثوں میں تقسیم کر دینی چاہیے:

مرنے والے کے ذمہ قرض ہو تو سب سے پہلے اس کے ترکے میں سے وہ ادا کیا جائے گا۔پھر کوئی وصیت اگر اس نے کی ہو تو وہ پوری کی جائے گی۔اس کے بعد وراثت تقسیم ہوگی۔

وارث کے حق میں وصیت نہیں ہوسکتی۔اسی طرح کوئی ایسا شخص کسی مرنے والے کا وارث نہیں ہوسکتا جس نے اس کے ساتھ قرابت کی بنیاد ہی اپنے کسی قول وفعل سے باقی نہ رہنے دی ہو۔

والدین اور بیوی یا شوہر کا حصہ دینے کے بعد ترکے کی وارث میت کی اولاد ہے۔مرنے والے نے کوئی لڑکا نہ چھوڑا ہو اور اس کی اولاد میں دو یا دو سے زائد لڑکیاں ہی ہوں تو انھیں بچے ہوئے ترکے کا دو تہائی دیا جائے گا۔ایک ہی لڑکی ہو تو وہ اس کے نصف کی حق دار ہوگی۔میت کی اولاد میں صرف لڑکے ہی ہوں تو یہ سارا مال ان میں تقسیم کر دیا جائے گا۔اولاد میں لڑکے لڑکیاں دونوں ہوں تو ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہوگا اور اس صورت میں بھی سارا مال انھیں میں تقسیم کیا جائے گا۔

اولاد کی غیر موجودگی میں میت کے بھائی بہن اولاد کے قائم مقام ہیں۔والدین اور بیوی یا شوہر موجود ہوں تو ان کا حصہ دینے کے بعد میت کے وارث یہی ہوں گے۔ذکور واناث کے لیے ان کے حصے اور ان میں تقسیمِ وراثت کا طریقہ وہی ہے جو اولاد کے لیے اوپر بیان ہوا ہے۔

میت کے اولاد ہو یا اولاد نہ ہو اور بھائی بہن ہوں تو والدین میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصہ دیا جائے گا۔بھائی بہن بھی نہ ہوں تو بیوی یا شوہر کا حصہ دینے کے بعد باقی ترکے کا ایک تہائی ماں کو ملے گا اور دو تہائی کا حق دار میت کا باپ ہوگا۔اگر زوجین میں سے بھی کوئی نہ ہو تو سارا ترکہ اسی اصول کے مطابق والدین میں تقسیم کر دیا جائے گا۔

مرنے والا مرد ہو اور اس کی اولاد ہو تو اس کی بیوی کو ترکے کا آٹھواں حصہ ملے گا۔اس کے اولاد نہ ہو تو وہ ایک چوتھائی ترکے کی حق دار ہوگی۔میت عورت ہو اور اس کی اولاد نہ ہو تو نصف ترکہ اس کے شوہر کا ہے، اور اگر اس کے اولاد ہو تو شوہر کو چوتھائی ترکہ ملے گا۔

ان وارثوں کے علاوہ یا ان کا حصہ دینے کے بعد یا ان کی عدم موجودگی میں، مرنے والا اگر چاہے تو والدین اور اولاد کے سوا دور ونزدیک کے کسی رشتہ دار کو ترکے کا وارث بنا سکتا ہے۔جس رشتہ دار کو وارث بنایا گیا ہو، اس کا ایک بھائی یا بہن ہو تو چھٹا حصہ اور ایک سے زیادہ بھائی بہن ہوں تو ایک تہائی انھیں دینے کے بعد باقی ۵/۶ یا دو تہائی اسے ملے گا۔

کوئی شخص اگر اس طرح وارث بنائے بغیر دنیا سے رخصت ہو جائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ یہ بچا ہوا ترکہ 'الاقرب فالاقرب' کے اصول پر اس کے مرد رشتہ داروں کو دے دینا چاہیے۔

تزکیۂ معیشت کا یہ قانون ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہم کو دیا ہے۔ اس پر عمل کے نتیجے میں انسان کو بعض اوقات جن مالی نقصانات سے دوچار ہونا پڑتا اور اپنے جو مفادات قربان کرنا پڑتے ہیں، ان کا صلہ تو وہ ابدی بادشاہی ہی ہے جو اللہ تعالیٰ قیامت کے بعد اپنے بندوں کو عطا فرمائیں گے، لیکن مسلمانوں کے ساتھ اللہ نے وعدہ فرمایا ہے کہ اپنی قومی حیثیت میں وہ اگر ایمان و تقویٰ پر قائم ہو جائیں تو ان کا پروردگار اس دنیا میں بھی اپنی رحمتوں کے دروازے ان کے لیے کھول دے گا۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ۔ (الاعراف ۷:۹۶)

”اور ان بستیوں کے لوگ اگر ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان و زمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔“

قرآن نے بتایا ہے کہ سیدنا نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کے سامنے یہ سنتِ الٰہی اس طرح بیان فرمائی:

فَقُلْتُ: اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ، اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا۔ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا، وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِيْنَ وَ يَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّ يَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا۔ (نوح ۷۱:۱۰-۱۲)

”میں نے کہا: اپنے رب سے معافی مانگ لو، بے شک وہ بڑا معاف کر دینے والا ہے۔ (اس کے نتیجے میں) وہ تم پر چھاجوں مینہ برسائے گا اور مال و اولاد سے تم کو برکت دے گا، اور تمھارے لیے باغ اگائے گا اور تمھارے لیے نہریں بہا دے گا۔“

زکوٰۃ کی فرضیت

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا، وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ، هُوَ خَيْرًا وَّ اَعْظَمَ اَجْرًا۔ (المزمل ۷۳:۲۰)

”اور (اپنے شب و روز میں) نماز کا اہتمام رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور (دین و ملت کی ضرورتوں کے لیے) اللہ کو قرض دو، اچھا قرض اور (یاد رکھو کہ) جو کچھ بھلائی تم اپنے لیے آگے بھیجو گے، اسے اللہ کے ہاں اس سے بہتر اور ثواب میں برتر پاؤ گے۔“

اس آیت میں اور اس کے علاوہ قرآن کے متعدد مقامات پر مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے اموال میں سے زکوٰۃ ادا کریں۔ اس لفظ کی اصل نمو اور طہارت ہے۔ یعنی وہ مال جو پاکیزگی اور برکت حاصل کرنے کے لیے اللہ کی راہ میں دیا جائے۔ سورۂ توبہ (۹) کی آیت ۱۰۳ اور سورۂ روم (۳۰) کی آیت ۳۹ میں 'تزکیھم' اور 'ھم المضعفون' کے الفاظ سے

قرآن نے اس کے انھی مفاہیم کی طرف اشارہ کیا ہے۔ بعد میں یہ ان اموال کے لیے خاص ہو گیا جو نظم اجتماعی کی ضرورتوں کے لیے اربابِ حل وعقد کے سپرد کیے جاتے ہیں۔قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز ہی کی طرح یہ زکوٰۃ بھی خدا کے پیغمبروں کی شریعت میں ایک لازمی حکم کی حیثیت سے ہمیشہ موجود رہی ہے۔اللہ تعالیٰ نے جب مسلمانوں کو اس کے ادا کرنے کی ہدایت کی تو یہ ان کے لیے کوئی اجنبی چیز نہ تھی۔ دین ابراہیمی کے تمام پیرو اس کی حقیقت اور اس سے متعلق احکام سے واقف تھے۔لہٰذا اس بات کی ہرگز کوئی ضرورت نہ تھی کہ اس کی تفصیلات قرآن میں بیان کی جائیں۔ یہ پہلے سے موجود ایک سنت تھی جسے قرآن نے زندہ کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کے حکم سے مسلمانوں میں جاری کر دیا۔اس کے جو احکام صحابہ کے اجماع اور عملی تواتر سے ہم تک پہنچے ہیں اور اب امت کے اجماع سے ثابت ہیں، ان کے سمجھنے میں فقہا کے اختلافات سے قطع نظر کر کے انھیں اگر شریعت میں ان کی اصل کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ہم انھیں اس طرح بیان کر سکتے ہیں:

۱۔ پیداوار کے عوامل، ذاتی استعمال کی چیزوں اور حدِ نصاب سے کم سرمایہ کے سوا کوئی چیز بھی زکوٰۃ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ یہ ہر مال، ہر قسم کے مواشی اور ہر نوعیت کی پیداوار پر عائد ہوگی، اور ہر سال ریاست کے ہر مسلمان شہری سے لازماً وصول کی جائے گی، اِلّا یہ کہ ریاست کسی ضرورت کے تحت کسی چیز کو اس سے مستثنیٰ قرار دے۔

۲۔ مال، مواشی اور زرعی پیداوار میں اس کا نصاب مقرر ہے اور وہ درجِ ذیل ہے:

مال میں ۵ اوقیہ/ ۶۱۲ گرام چاندی یا اس کی قیمت

پیداوار میں ۵ وسق/ ۱۱۱۹ کلوگرام کھجور یا اس کی قیمت

مواشی میں ۵ اونٹ، ۳۰ گائیں اور ۴۰ بکریاں۔

۳۔اس کی شرح یہ ہے:

مال میں ۲ ۱/۲ فی صد سالانہ۔

پیداوار میں اگر وہ اصلاً محنت یا اصلاً سرمایہ سے وجود میں آئے تو ہر پیداوار کے موقع پر اس کا ۱۰ فی صدی اور اگر محنت اور سرمایہ دونوں کے تعامل سے وجود میں آئے تو ۵ فی صدی اور دونوں کے بغیر محض عطیۂ خداوندی کے طور پر حاصل ہو جائے تو ۲۰ فی صدی۔

مواشی میں:

۱۔ اونٹ

۵ سے ۲۴ تک، ہر پانچ اونٹوں پر ایک بکری

۲۵ سے ۳۵ تک، ایک یک سالہ اونٹنی اور اگر وہ میسر نہ ہو تو دو سالہ اونٹ

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۳۶ سے ۴۵ تک، ایک دو سالہ اونٹنی

۴۶ سے ۶۰ تک، ایک سہ سالہ اونٹنی

۶۱ سے ۷۵ تک، ایک چار سالہ اونٹنی

۷۶ سے ۹۰ تک، دو، دو سالہ اونٹنیاں

۹۱ سے ۱۲۰ تک، دو، سہ سالہ اونٹنیاں

۱۲۰ سے زائد کے لیے ہر ۴۰ پر ایک دو سالہ اور ہر ۵۰ پر ایک سہ سالہ اونٹنی۔

ب۔ گائیں

ہر ۳۰ پر ایک یک سالہ اور ہر ۴۰ پر ایک دو سالہ بچھڑا۔

ج ۔بکریاں

۴۰ سے ۱۲۰ تک، ایک بکری

۱۲۱ سے ۲۰۰ تک، دو بکریاں

۲۰۱ سے ۳۰۰ تک، تین بکریاں

۳۰۰ سے زائد میں ہر ۱۰۰ پر ایک بکری۔

اس کے مصارف سے متعلق کوئی ابہام نہ تھا۔ یہ ہمیشہ فقرا و مساکین اور نظم اجتماعی کی ضرورتوں ہی کے لیے خرچ کی جاتی تھی، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جب منافقین نے اعتراضات کیے تو قرآن نے پوری وضاحت کے ساتھ بتا دیا کہ یہ کہاں اور کس مقصد سے خرچ کی جا رہی ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰکِیْنِ وَالْعٰمِلِیْنَ عَلَیْهَا وَ الْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَ فِی الرِّقَابِ وَالْغَارِمِیْنَ وَفِی سَبِیْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِیْلِ ، فَرِیْضَةً مِّنَ اللّٰهِ، وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ ۔ (التوبہ ۹:۶۰)

’’یہ صدقات تو بس فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں، اور ان کے لیے جو ان پر عامل بنائے جائیں، اور ان کے لیے جن کی تالیفِ قلب مطلوب ہو، اور اس لیے کہ یہ گردنوں کے چھڑانے اور تاوان زدوں کی مدد کرنے میں، راہِ خدا میں اور مسافروں کی بہبود کے لیے خرچ کیے جائیں ۔ یہ اللہ کا مقرر کردہ فریضہ ہے اور اللہ علیم وحکیم ہے۔‘‘

اس آیت میں جو مصارف بیان ہوئے ہیں، ان کی تفصیل یہ ہے:

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

۱۔فقرا و مساکین کے لیے۔

۲۔'العاملین علیھا' یعنی ریاست کے تمام ملازمین کی خدمات کے معاوضے میں[1]۔

۳۔'المؤلفة قلوبھم' یعنی اسلام اور مسلمانوں کے مفاد میں تمام سیاسی اخراجات کے لیے۔

۴۔'فی الرقاب' یعنی ہر قسم کی غلامی سے نجات کے لیے۔

۵۔'الغٰرمین' یعنی کسی نقصان، تاوان یا قرض کے بوجھ تلے دبے ہوئے لوگوں کی مدد کے لیے۔

۶۔'فی سبیل اللّٰہ' یعنی دین کی خدمت اور لوگوں کی بہبود کے کاموں میں۔

۷۔'ابن السبیل' یعنی مسافروں کی مدد اور ان کے لیے سڑکوں، پلوں، سراؤں وغیرہ کی تعمیر کے لیے۔

زکوٰۃ سے متعلق شریعت یہی ہے۔ تاہم اس معاملے میں عام غلط فہمیوں کے باعث یہ چند باتیں مزید واضح رہنی چاہییں:

ایک یہ کہ زکوٰۃ کے مصارف پر تملیک ذاتی کی جو شرط ہمارے فقہا نے عائد کی ہے، اس کے لیے کوئی ماخذ قرآن وسنت میں موجود نہیں ہے، اس وجہ سے زکوٰۃ جس طرح فرد کے ہاتھ میں دی جا سکتی، اسی طرح اس کی بہبود کے کاموں میں بھی خرچ کی جا سکتی ہے[2]۔

دوسری یہ کہ جو کچھ صنعتیں اس زمانے میں وجود میں لائیں اور اہل فن اپنے فن کے ذریعے سے پیدا کرتے اور جو کچھ کرایے، فیس اور معاوضۂ خدمات کی صورت میں حاصل ہوتا ہے، وہ بھی اگر مناط حکم کی رعایت ملحوظ رہے تو پیداوار ہی ہے۔ اس وجہ سے اس کا الحاق اموال تجارت کے بجائے مزروعات سے ہونا چاہیے اور اس معاملے میں وہی ضابطہ اختیار کرنا چاہیے جو شریعت نے زمین کی پیداوار کے لیے متعین کیا ہے۔

تیسری یہ کہ اس اصول کے مطابق کرایے کے مکان، جائدادیں اور دوسری اشیا اگر کرایے پر اٹھی ہوں تو مزروعات کی اور اگر نہ اٹھی ہوں تو ان پر مال کی زکوٰۃ عائد کرنی چاہیے۔

چوتھی یہ کہ اس طرح جو چیزیں اصل سے ملحق کی جائیں۔ ان کا نصاب اسلامی ریاست اگر ضرورت محسوس کرے تو اسی اصل پر قیاس کر کے خود مقرر کر سکتی ہے۔

۱؎ اس لیے کہ ریاست کے تمام ملازمین درحقیقت 'العاملین علی اخذ الضرائب وردھا الی المصارف' ہی ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ نہایت بلیغ تعبیر ہے جو قرآن نے اس مدعا کو ادا کرنے کے لیے اختیار کی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ لوگ بالعموم اسے سمجھنے سے قاصر رہے ہیں، لیکن اس کی جو تالیف ہم نے بیان کی ہے، اس کے لحاظ سے دیکھیے تو اس کا یہ مفہوم بادنیٰ تامل واضح ہو جاتا ہے۔

۲؎ اس موضوع پر مفصل بحث کے لیے ملاحظہ ہو، استاذ امام امین احسن اصلاحی کی کتاب ''توضیحات'' میں ان کا مضمون: ''مسئلۂ تملیک''۔

حرمت ملکیت

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ۔ (التوبہ ۹:۵)

''پھر اگر وہ توبہ کرلیں، نماز کا اہتمام کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کی راہ چھوڑ دو۔''

سورۂ توبہ میں یہ آیت مشرکین عرب کے سامنے ان شرائط کی وضاحت کے لیے آئی ہے جنھیں پورا کر دینے کے بعد وہ مسلمانوں کی حیثیت سے اسلامی ریاست کے شہری بن سکتے تھے۔ اس میں 'فخلوا سبیلھم' (ان کی راہ چھوڑ دو) کے الفاظ، اگر غور کیجیے تو پوری صراحت کے ساتھ اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ آیت میں بیان کی گئی شرائط پوری کرنے کے بعد جو لوگ بھی اسلامی ریاست کی شہریت اختیار کریں، اس ریاست کا نظام جس طرح ان کی جان، آبرو اور عقل و رائے کے خلاف کوئی تعدی نہیں کرسکتا، اسی طرح ان کے املاک، جائدادوں اور اموال کے خلاف بھی کسی تعدی کا حق اس کو حاصل نہیں ہے۔ وہ اگر اسلام کے ماننے والے ہیں، نماز پر قائم ہیں اور زکوٰۃ دینے کے لیے تیار ہیں تو عالم کے پروردگار کا حکم یہی ہے کہ اس کے بعد ان کی راہ چھوڑ دی جائے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمانِ واجب الاذعان کی رو سے ایک مٹھی بھر گندم، ایک بالشت زمین، ایک پیسا، ایک حبہ بھی کوئی ریاست اگر چاہے تو ان کے اموال میں سے زکوٰۃ لے لینے کے بعد بالجبر ان سے نہیں لے سکتی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وضاحت میں فرمایا ہے:

امرت ان اقاتل الناس حتی یشھدوا ان لا الٰہ الا اللّٰہ وان محمداً رسول اللّٰہ ویقیموا الصلوٰۃ ویؤتوا الزکوٰۃ ۔ فاذا فعلوا عصموا منی دماء ھم واموالھم الّا بحقھا و حسابھم علی اللّٰہ ۔ (مسلم، رقم ۳۶)

''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں[۳]، یہاں تک کہ وہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ وہ یہ شرائط تسلیم کرلیں تو ان کی جانیں اور ان کے مال مجھ سے محفوظ ہو جائیں گے، اِلّا یہ کہ وہ ان سے متعلق کسی حق کے تحت اس سے محروم کر دیے جائیں[۴]۔ رہا ان کا حساب تو وہ اللہ کے ذمے ہے۔''

یہی بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر نہایت بلیغ اسلوب میں بیان فرمائی اور واضح کر دیا ہے کہ

۳؎ ان روایات میں جنگ کے ذکر سے کسی کو غلط فہمی نہ ہو۔ یہ محض اس لیے ہوا ہے کہ اس وقت معاملہ مشرکین عرب سے تھا، جن کے بارے میں قرآن نے وضاحت کر دی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اتمامِ حجت کے بعد انھیں اسلام یا تلوار میں سے کسی

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

مسلمان کے مال کی حرمت ابدی ہے۔ اذنِ خداوندی کے بغیر کوئی شخص بھی، خواہ وہ مسلمانوں کا حکمران ہی کیوں نہ ہو، اس کو ہرگز پامال نہیں کرسکتا۔ ارشاد فرمایا ہے:

ان دماء کم و اموالکم حرام علیکم کحرمة یومکم ھذا فی شھرکم ھذا، فی بلدکم ھذا (مسلم، رقم ۱۲۱۸)

''بے شک، تمھارے خون اور تمھارے مال تم پر اسی طرح حرام ہیں، جس طرح تمھارا یہ دن (یوم النحر)، تمھارے اس مہینے (ذوالحجہ) اور تمھارے اس شہر (ام القریٰ مکہ) میں۔''

اس سے واضح ہے کہ اس آیت کی رو سے اسلامی ریاست زکوٰۃ کے علاوہ جس کی شرح اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کی وساطت سے مختلف اموال میں مقرر کردی ہے، اپنے مسلمان شہریوں پر کسی نوعیت کا کوئی ٹیکس بھی عائد نہیں کرسکتی۔

یہ دین کا قطعی حکم ہے جس کے ذریعے سے وہ نہ صرف یہ کہ عوام اور حکومت کے مابین مالی معاملات سے متعلق ہر کشمکش کا خاتمہ کرتا، بلکہ حکومتوں کے لیے اپنی چادر سے باہر پاؤں پھیلا کر قومی معیشت میں عدمِ توازن پیدا کردینے کا ہر امکان بھی ہمیشہ کے لیے ختم کردیتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

قومی شعبہ

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰی فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَةً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ۔ (الحشر ۵۹: ۷)

''اللہ نے جو کچھ ان بستیوں کے لوگوں سے اپنے رسول کی طرف لوٹایا ہے، وہ اللہ، اس کے پیغمبر، پیغمبر کے اقربا[۵] اور یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے خاص رہے گا۔ اس لیے کہ وہ تمھارے دولت مندوں ہی میں گردش نہ کرتا رہے۔''

یہ آیت جس سیاق میں آئی ہے، اسے سورۂ حشر میں دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ رسالت میں جب لوگوں نے ان

ایک کا انتخاب بہرحال کرنا تھا۔

۴؎ یعنی مثال کے طور پر، وہ کسی کو قتل کردیں اور اس کی پاداش میں انھیں بھی قتل کیا جائے یا ان سے دیت وصول کی جائے۔

۵؎ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اقربا کو چونکہ صدقات میں سے کچھ لینے کی ممانعت کردی تھی، اس وجہ سے قومی شعبے کے ان اموال میں ایک حصہ ان کے لیے بھی خاص کیا گیا۔

اموال، زمینوں اور جائدادوں کے بارے میں جو دشمن سے بغیر کسی جنگ کے حاصل ہوئی تھیں، یہ مطالبہ کیا کہ وہ ان میں تقسیم کر دی جائیں تو قرآن نے اسے ماننے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ انھیں نجی ملکیت میں دینے کے بجائے دین وملت کی اجتماعی ضرورتوں اور قوم کے غربا و مساکین کی مدد اور کفالت کے لیے وقف رہنا چاہیے تاکہ یہ دولت مندوں ہی میں گردش نہ کرتی رہیں اور ان کا فائدہ ان لوگوں کو پہنچے جو اپنی خلقی کمزوریوں یا اسباب و وسائل سے محرومی کے باعث اپنے آپ کو ان کے حصول کی جدوجہد میں حصہ لینے کے قابل نہیں پاتے یا کسی وجہ سے اس میں دوسروں سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔

یہ اموال چونکہ مسلمانوں کی کسی مدد کے بغیر محض اللہ تعالیٰ کی قوتِ قاہرہ سے حاصل ہوئے تھے، اس وجہ سے سب کے سب اس مقصد کے لیے خاص کیے گئے۔ جزیرہ نمائے عرب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جہاد وقتال کی مخصوص نوعیت کے پیشِ نظر اس زمانے کے عام غنائم بھی اللہ و رسول ہی کی ملکیت تھے[٦] لیکن ان کے حصول میں چونکہ لوگوں نے آپ کی مدد کی تھی اور انھیں اس زمانے میں ذاتی اسلحہ، گھوڑے اور اونٹ وغیرہ جنگ میں استعمال کرنا پڑتے تھے، یہاں تک کہ اپنے زادِ راہ کا بندوبست بھی خود ہی کرنا ہوتا تھا، اس لیے ضروری تھا کہ یہ مجاہدین میں تقسیم کر دیے جائیں۔ تاہم قرآن نے حکم دیا کہ ان میں سے بھی پانچواں حصہ اس مقصد کے لیے نکال لیا جائے:

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ۔ (الانفال ۸: ۴۱)

”اور جان لو کہ جو غنیمتیں بھی تم نے پائی ہیں، ان میں سے پانچواں حصہ اللہ، اس کے پیغمبر، پیغمبر کے اقربا اور یتیموں، مسکینوں اور مسافروں ہی کے لیے خاص رہے گا۔“

اس زمانے کی اصطلاحات مستعار لیجیے تو ان احکام سے گویا قرآن کا منشا یہ تھا کہ معیشت میں نجی شعبے کے پہلو بہ پہلو ایک قومی شعبہ بھی ہر حال میں موجود رہنا چاہیے۔ اس لیے کہ ریاست کی سطح پر تنہا یہی طریقہ ہے جس سے معاشرے میں دولت کی گردش کو متوازن رکھا جا سکتا اور نجی شعبے کی ترقی کے نتیجے میں دولت کے بعض طبقوں میں ارتکاز کا جو مسئلہ لازماً پیدا ہو جاتا ہے، اس کے برے نتائج سے معاشرے کو بڑی حد تک محفوظ رکھنے کی جدوجہد کی جا سکتی ہے۔

رہا ان اموال کے بندوبست کا معاملہ تو اسے شریعت نے حالات و مصالح پر چھوڑ دیا ہے، لہٰذا مسلمانوں کے اولوالامر ان کے اربابِ حل وعقد کے مشورے سے اس کے لیے جو طریقہ چاہیں اختیار کر سکتے ہیں۔ چنانچہ یہ معلوم ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے میں خیبر کی زمینیں اسی مقصد سے بٹائی پر دیں[٧]۔ بعض رقبے جن افراد کے لیے خاص کیے، انھی کے

---

٦ الانفال ۸: ۱۔

٧ مسلم، رقم ۱۵۵۱۔

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

تصرف میں رہنے دیے[8] بعض کو حمیٰ قرار دیا[9] بعض چیزوں میں سب مسلمان یکساں شریک ٹھیرائے[10] بعض چشموں اور نہروں سے انتفاع کے لیے 'الاقرب فالاقرب' کا قاعدہ مقرر کیا[11] اور سیدنا فاروق رضی اللہ عنہ نے عراق و شام کی مفتوحہ زمینیں اپنے عہدِ خلافت میں ان کے پرانے مالکوں ہی کے تصرف میں چھوڑ کر ان کی پیداوار کے لحاظ سے ایک متعین رقم ان پر بطورِ خراج عائد کر دی۔[12]

عدم اہلیت

وَلَاتُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۔ (النساء۴:۵)

''اور تم اپنا وہ مال جس کو اللہ نے تمھارے لیے قیام و بقا کا ذریعہ بنایا ہے، ان بے سمجھوں کے حوالے نہ کرو۔ ہاں، اس سے ان کو فراغت کے ساتھ کھلاؤ، پہناؤ اور دستور کے مطابق ان کی دل داری کرتے رہو۔''

سورۂ نساء کی یہ آیت اپنے سیاق و سباق کے لحاظ سے یتامیٰ اور ان کے سرپرستوں سے متعلق ہے۔ اس میں لوگوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ مال کو چونکہ اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کے قیام و بقا کا ذریعہ بنایا ہے، اس لیے یتیم اگر ابھی نادان اور بے سمجھ ہوں تو سرپرستوں کا فرض ہے کہ وہ انفرادی حق کے ساتھ خاندانی اور اجتماعی بہبود کو بھی پیش نظر رکھیں اور جب تک وہ اپنی ذمہ داریاں حسن و خوبی کے ساتھ ادا کرنے کے قابل نہ ہو جائیں، ان کا مال ان کے حوالے نہ کریں، بلکہ خود اس کی حفاظت اور نگرانی کا اہتمام کرتے رہیں۔

آیت کا سیاق یہی ہے، لیکن اس کے الفاظ پر غور کیجیے تو یہ بات صاف واضح ہوتی ہے کہ اس میں حکم کا مبنیٰ یتیمی نہیں، بلکہ سفاہت، یعنی بے سمجھی اور نادانی ہے۔ چنانچہ یہ بات اس سے نکلتی ہے کہ اس میں جو حق یتیم کے سرپرستوں کو دیا گیا ہے، وہی حق اگر حکم کا مبنیٰ موجود ہو تو ریاست کو بھی اس کے باشندوں پر لازماً حاصل ہوگا۔ چنانچہ اس کی رو سے کوئی شخص اگر اپنی

---

[8] ابوداؤد، رقم ۳۰۵۸۔

[9] بخاری، رقم ۲۳۷۰۔

[10] ابن ماجہ، رقم ۲۵۰۲، ۲۵۰۳۔

[11] بخاری، رقم ۳۲۶۱۔

[12] کتاب الخراج، ابو یوسف ۲۶۔۲۹۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

حماقت، بے راہ روی اور نادانی کے باعث مال و متاع کے ضیاع اور ذرائعِ پیداوار کی بربادی کا سامان کرتا ہے تو ریاست کا فرض ہے کہ وہ اس کے املاک میں حقِ تصرف سے اسے معزول کر کے ان کا نظم خود سنبھال لے۔ یہ سوسائٹی کے قیام و بقا اور اس کی بہبود کا تقاضا ہے جسے ہر حال میں پورا ہونا چاہیے۔ تاہم اس کے ساتھ یہ ہدایت بھی کی گئی ہے کہ جس شخص کو حقِ تصرف سے معزول کیا جائے، اس کے مال سے اس کی ضروریات کا بندوبست نہایت فراخ دلی کے ساتھ ہونا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے 'وارزقوھم منھا' کے بجائے 'وارزقوھم فیھا' کے جو الفاظ آیت میں آئے ہیں، وہ عربیت کی رو سے اسی مفہوم پر دلالت کرتے ہیں۔

اکل الاموال بالباطل

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ، لَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَکُوْنَ تِجَارَۃً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْکُمْ ۔ (النساء۴: ۲۹)

''ایمان والو، تم آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ، الاّ یہ کہ وہ رضا مندی کی تجارت سے کسی کو حاصل ہو جائے۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اس آیت میں دوسروں کا مال ان طریقوں سے کھانے کی ممانعت کی گئی ہے جو عدل و انصاف، معروف، دیانت اور سچائی کے خلاف ہیں۔ اسلام میں معاشی معاملات سے متعلق تمام حرمتوں کی بنیاد اللہ تعالیٰ کا یہی حکم ہے۔ رشوت، چوری، غصب، غلط بیانی، تعاون علی الاثم، غبن، خیانت اور لقطہ کی مناسب تشہیر سے گریز کے ذریعے سے دوسروں کا مال لے لینا، یہ سب اسی کے تحت داخل ہیں۔ ان چیزوں پر مفصل بحث کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے کہ ان کا گناہ ہونا تمام دنیا کے معروفات اور ہر دین و شریعت میں ہمیشہ مسلم رہا ہے۔ وہ معاملات جو دوسروں کے لیے ضرر و غرر، یعنی نقصان یا دھوکے کا باعث بنتے ہیں، وہ بھی اسی کی ایک فرع ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی جو صورتیں، اپنے زمانے میں ممنوع قرار دیں، وہ یہ ہیں:

چیزیں بیچنا، اس سے پہلے کہ وہ قبضہ میں آئیں۔[۱۳]

ڈھیر کے حساب سے غلہ خرید کر، اسے اپنے ٹھکانوں پر لانے سے پہلے بیچ دینا۔[۱۴]

دیہاتی کے لیے کسی شہری کی خرید و فروخت۔[۱۵]

۱۳؎ بخاری، رقم ۲۱۳۱۔

۱۴؎ بخاری، رقم ۲۱۶۷۔

محض دھوکا دینے کے لیے، ایک دوسرے سے بڑھ کر بولی دینا۔[16]

کسی شخص کے سودے پر اپنا سودا بنانے کی کوشش کرنا۔[17]

محاقلہ، یعنی کوئی شخص اپنی کھیتی خوشہ ہی میں بیچ دے۔[18]

مزابنہ ، یعنی کھجور کے درخت پر اس کا پھل درخت سے اتری ہوئی کھجور کے عوض بیچنا۔[19]

معاومہ، یعنی درختوں کا پھل کئی سال کے لیے بیچ دینا۔[20]

ثنیا، یعنی بیع میں کوئی مجہول استثنا باقی رکھا جائے۔ اس کی صورت یہ تھی کہ غلہ بیچنے والا، مثال کے طور پر، یہ کہہ دیتا کہ میں نے یہ غلہ تیرے ہاتھ بیچ دیا، مگر اس میں سے تھوڑا نکال لوں گا۔[21]

ملامسہ، یعنی ہر ایک دوسرے کا کپڑا بے سوچے سمجھے چھو لے اور اس طرح اس کی بیع منعقد ہو جائے۔[22]

منابذہ، یعنی ہر ایک اپنی کوئی چیز دوسرے کی طرف پھینک دے اور اس طرح اس کی بیع منعقد قرار پائے۔[23]

بیع الی حبل الحبلہ ، یعنی اونٹ اس طرح بیچے جائیں کہ اونٹنی جو کچھ جنے ، پھر اس کا بچہ حاملہ ہو اور جنے تو اس کا سودا طے ہو۔[24]

بیع الحصاۃ ، یعنی کنکری کی بیع۔ اس کی دو صورتیں بالعموم رائج تھیں: ایک یہ کہ اہلِ جاہلیت زمین کا سودا طے کر لیتے ، پھر کنکری پھینکتے اور جہاں تک وہ جاتی ، اسے زمین کی مساحت قرار دے کر مبیع کی حیثیت سے خریدار کے حوالے کر دیتے۔ دوسری یہ کہ کنکری پھینکتے اور کہتے کہ یہ جس چیز پر پڑے گی، وہی مبیع قرار پائے گی۔[25]

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۱۵؎ بخاری، رقم ۲۱۴۰۔

۱۶؎ بخاری، رقم ۲۱۴۲۔

۱۷؎ بخاری، رقم ۲۱۴۰۔

۱۸؎ مسلم، رقم ۱۵۳۶۔

۱۹؎ مسلم، رقم ۱۵۴۲۔

۲۰؎ مسلم، رقم ۱۵۳۶۔

۲۱؎ مسلم، رقم ۱۵۳۶۔

۲۲؎ مسلم، رقم ۱۵۱۱۔

۲۳؎ بخاری، رقم ۲۱۴۶۔

۲۴؎ بخاری، رقم ۱۵۱۴۔

۲۵؎ مسلم، رقم ۱۵۱۳۔

درختوں کے پھل بیچ دینا، اس سے پہلے کہ ان کی صلاحیت واضح ہو۔[26]

بالی بیچ دینا، اس سے پہلے کہ وہ سفید ہو کر آفتوں سے محفوظ ہو جائے۔[27]

اپنے بھائی کے ہاتھ کوئی ایسی چیز بیچنا جس میں عیب ہو، الاّ یہ کہ اسے واضح کر دیا جائے۔[28]

اونٹ یا بکری کا دودھ، انھیں بیچنے سے پہلے ان کے تھنوں میں روک کر رکھنا۔[29]

بازار میں پہنچنے سے پہلے آگے جا کر تاجروں سے ملنا اور ان کا مال خریدنے کی کوشش کرنا۔[30]

کسی چیز کی پیشگی قیمت دے کر اس طرح بیع کرنا کہ تیار ہونے پر وہ چیز لے لی جائے گی، الاّ یہ کہ معاملہ ایک معین ماپ اور ایک معین تول کے ساتھ اور ایک معین مدت کے لیے کیا جائے۔[31]

مخابرہ، یعنی بٹائی کی وہ صورتیں اختیار کی جائیں جن میں کھیتی والے کا منافع معین قرار پائے۔[32]

زمین اس طرح بٹائی پر دینا کہ زمین کے ایک معین حصے کی پیداوار زمین کے مالک کا حق قرار پائے۔[33]

ایسی جائدادیں جو ابھی تقسیم نہ ہوئی ہوں، ان کے شریکوں کو خریدنے کا موقع دیے بغیر انھیں بیچ دینا، الاّ یہ کہ حدود متعین ہو جائیں اور راستے الگ کر دیے جائیں۔[34]

ہم سایے کے ساتھ راستہ ایک ہو تو اپنی جائداد اسے خریدنے کا موقع دیے بغیر بیچ دینا۔[35]

عام ضرورت کی چیزیں منڈی میں ان کی قلت پیدا کرنے اور اس طرح قیمت بڑھانے کے لیے روک رکھنا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شدت کے ساتھ اسے ممنوع قرار دیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

۲۶؎ مسلم، رقم ۱۵۳۴۔

۲۷؎ مسلم، رقم ۱۵۳۵۔

۲۸؎ ابن ماجہ، رقم ۲۲۴۶۔

۲۹؎ بخاری، رقم ۲۱۴۸۔

۳۰؎ مسلم، رقم ۱۵۱۷۔

۳۱؎ بخاری، رقم ۲۲۵۳۔

۳۲؎ مسلم، رقم ۱۵۳۶۔

۳۳؎ بخاری، رقم ۲۳۲۷۔

۳۴؎ بخاری، رقم ۲۲۵۷۔

۳۵؎ ترمذی، رقم ۱۳۶۹۔

مـن دخل فی اسعار المسلمین لیغلیه علیھم ، کـان حـقاً علی اللّٰہ تبارك وتـعالیٰ ان یعقدہ بعظم من النار یوم القیامة ـ (احمد بن حنبل، رقم ۱۹۸۰۲)

''جس نے چیزوں کے بھاؤ چڑھانے کے لیے مسلمانوں کے بازار میں کوئی مداخلت کی تو اللہ تعالیٰ یہ حق رکھتے ہیں کہ قیامت کے دن ایک بڑی آگ کو اس کا ٹھکانا بنا دیں۔''

بیع وشرا اور مزارعت وغیرہ کی یہ صورتیں ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ممنوع قرار دی ہیں۔ان کے بارے میں یہ بات یہاں واضح رہنی چاہیے کہ ضرر وغرر کی جس علت پر یہ مبنی ہیں، وہ اگر شرائط واحوال کی تبدیلی سے کسی وقت ان میں مفقود ہو جائے تو جس طرح ان کی ممانعت ختم ہو جائے گی، اسی طرح تمدن کے ارتقا کے نتیجے میں یہ علت اگر کسی حادث معاشی معاملے میں ثابت ہو جائے تو اس کی اباحت بھی لازماً ختم قرار پائے گی۔

سود اور جوا بھی اسی اکل الاموال بالباطل میں داخل اور اس سلسلہ کے بدترین جرائم ہیں۔ان کے بارے میں قرآن کا نقطۂ نظر ہم یہاں کسی قدر تفصیل سے بیان کریں گے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

جوا

جوئے کے بارے میں ہر شخص جانتا ہے کہ یہ نری قسمت آزمائی ہے۔قرآنِ مجید نے اسے 'رجس من عمل الشیطان' (نجس، شیطانی کاموں میں سے) قرار دیا ہے۔اس کے لیے یہ تعبیر، بالبداہت واضح ہے کہ اس اخلاقی فساد کی بنا پر اختیار کی گئی ہے جو اس سے آدمی کی شخصیت میں پیدا ہوتا اور بتدریج اس کے پورے وجود کا احاطہ کر لیتا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ معاشی عمل کی بنیاد اگر بیع وشرا اور خدمت واعانت پر رکھی جائے تو اس سے جس طرح انسان میں اخلاقِ عالیہ کے داعیات کو قوت حاصل ہوتی ہے، اسی طرح اس کی بنیاد اگر ان سب چیزوں کے بغیر محض اتفاقات اور قسمت آزمائی پر رکھ دی جائے تو اس کے نتیجے میں محنت، زحمت، خدمت اور جاں بازی سے گریز کا رویہ انسان میں پیدا ہو جاتا ہے۔پھر بزدلی و کم ہمتی اور اس طرح کے دوسرے اخلاقِ رذیلہ کی آکاس انسانی شخصیت کے شجرِ طیب پر نمایاں ہوتی اور آہستہ آہستہ عفت، عزت، ناموس، وفا و حیا اور غیرت وخودداری کے ہر احساس کو بالکل فنا کر دیتی ہے۔یہاں تک کہ انسان خدا کی یاد اور نماز سے غافل ہو جاتا اور دوسروں کے ساتھ اخوت ومحبت کے بجائے بغض وعداوت کے جذبات اپنے اندر پیدا کر لیتا ہے۔سورۂ مائدہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ

''ایمان والو، یہ شراب اور جوا اور تھان اور یہ قسمت کے تیر بالکل نجس شیطانی کام ہیں، اس لیے ان سے بچو

مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِ وَ یَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ عَنِ الصَّلٰوةِ، فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ۔(۵:۹۰-۹۱)

تاکہ تم فلاح پاؤ۔ شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ تمھیں شراب اور جوئے میں لگا کر تمھارے درمیان بغض اور عداوت ڈال دے اور تمھیں اللہ کی یاد اور نماز سے روک دے۔ پھر کیا تم ان چیزوں سے باز آتے ہو؟''

اس جوئے کے بارے میں ایک دل چسپ حقیقت یہ بھی ہے کہ اسلام سے پہلے کے عرب معاشرے میں یہ امیروں کی طرف سے فیاضی کے اظہار کا ایک طریقہ اور غریبوں کی مدد کا ایک ذریعہ بھی تھا۔ ان کے حوصلہ مند لوگوں میں یہ روایت تھی کہ جب سرما کا موسم آتا، شمال کی ٹھنڈی ہوائیں چلتیں اور ملک میں قحط کی سی حالت پیدا ہو جاتی تو وہ مختلف جگہوں پر اکٹھے ہوتے، شراب کے جام لنڈھاتے اور سرور و مستی کے عالم میں کسی کا اونٹ یا اونٹنی پکڑتے اور اسے ذبح کر دیتے۔ پھر اس کا مالک جو کچھ اس کی قیمت مانگتا، اسے دے دیتے اور اس کے گوشت پر جوا کھیلتے۔ اس طرح کے موقعوں پر غربا و فقرا پہلے سے جمع ہو جاتے تھے اور ان جوا کھیلنے والوں میں سے ہر شخص جتنا گوشت جیتتا جاتا، ان میں لٹاتا جاتا۔ عربِ جاہلی میں یہ بڑی عزت کی چیز تھی اور جو لوگ اس قسم کی تقریبات منعقد کرتے یا ان میں شامل ہوتے، وہ بڑے فیاض سمجھے جاتے تھے اور شاعر ان کے جود و کرم کی داستانیں اپنے قصیدوں میں بیان کرتے تھے۔ اس کے برعکس جو لوگ ان تقریبات سے الگ رہتے، انھیں 'برم' کہا جاتا تھا جس کے معنی عربی زبان میں بخیل کے ہیں۔

جوئے اور شراب کی یہی منفعت تھی جس کی بنا پر انھیں جب ممنوع قرار دیا گیا تو لوگ متردد ہوئے، لیکن قرآن نے صاف واضح کر دیا کہ ان کی یہ منفعت اپنی جگہ، مگر انسان کی شخصیت میں جو اخلاقی فساد ان سے پیدا ہوتا ہے، اس کے پیشِ نظر یہ کسی حال میں بھی گوارا نہیں کیے جا سکتے۔ ارشاد فرمایا ہے:

یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِ، قُلْ: فِیْهِمَآ اِثْمٌ كَبِیْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ، وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا۔ (البقرہ۲:۲۱۹)

''وہ تم سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دو: ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے کچھ منفعتیں بھی ہیں، لیکن ان کا گناہ ان کی منفعتوں سے بہت زیادہ ہے۔''

سود

سود بھی ایک ایسی ہی اخلاقی نجاست ہے جس میں ملوث افراد اور ادارے اپنے اصل سرمایے کو بالکل بے داغ محفوظ رکھ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کراور کوئی جوکھم برداشت کیے بغیر منافع بٹانے کے لیے اپنے مقروض کے سر پر سوار رہتے ہیں۔ عربی زبان میں اس کے لیے 'ربٰــــوا' کالفظ مستعمل ہے۔ قرآن نے اس کے لیے یہی لفظ استعمال کیا ہے۔ عربی زبان سے واقف ہر شخص جانتا ہے کہ اس سے مراد وہ معین اضافہ ہے جو قرض دینے والا اپنے مقروض سے محض اس بنا پر وصول کرتا ہے کہ اس نے ایک خاص مدت کے لیے اس کو روپے کے استعمال کی اجازت دی ہے۔ قرآنِ مجید نے اسے پوری شدت کے ساتھ ممنوع قرار دیا ہے۔ چنانچہ سورۂ بقرہ میں فرمایا ہے:

اَلَّـذِیْـنَ یَاْکُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْـمَسِّ، ذٰلِکَ بِـاَنَّـهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْـلُ الـرِّبٰـوا ، وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَ حَرَّمَ الـرِّبٰـوا۔ فَـمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰی فَلَهٗ مَا سَلَفَ ، وَاَمْرُهٗٓ اِلَی اللّٰهِ، وَمَـنْ عَـادَ فَاُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۔ (۲:۲۷۵)

''جولوگ سود کھاتے ہیں، وہ قیامت کے دن اٹھیں گے تو بالکل اس شخص کی طرح اٹھیں گے جس کو شیطان نے اپنی چھوت سے پاگل بنا دیا ہو۔ یہ اس وجہ سے ہوگا کہ انھوں نے کہا: بیع بھی تو آخر سود ہی کی طرح ہے اور تعجب ہے کہ اللہ نے بیع کو حلال اور سود کو حرام ٹھیرایا ہے۔ چنانچہ جس کو اس کے پروردگار کی یہ تنبیہ پہنچی اور وہ باز آ گیا تو جو کچھ وہ لے چکا، سو لے چکا اور اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے، اور جو اب اس کا اعادہ کریں گے تو وہی اہلِ دوزخ ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''

اسی سورہ میں آگے فرمایا ہے:

یٰٓـاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَـقِـیَ مِـنَ الرِّبٰوا ، اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۔ فَـاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِـهٖ، وَاِنْ تُبْتُـمْ فَـلَـکُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِکُمْ ، لَا تَظْلِمُوْنَ وَ لَاتُظْلَمُوْنَ ۔ (۲:۲۷۸۔۲۷۹)

''ایمان والو، اگر تم سچے مومن ہو تو اللہ سے ڈرو اور جو کچھ سود باقی رہ گیا ہے، اسے چھوڑ دو۔ پھر اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جنگ کے لیے خبردار ہو جاؤ۔ اور اگر تم توبہ کر لو تو اصل رقم کا تمھیں حق ہے، نہ تم ظلم کرو گے اور نہ تم پر ظلم کیا جائے گا۔''

ان آیات میں سود خواروں کے قیامت میں پاگلوں کی طرح اٹھنے کی وجہ قرآن نے یہ بتائی ہے کہ وہ اس بات پر تعجب کا اظہار کرتے ہیں کہ اللہ نے بیع و شرا کو حلال اور سود کو حرام ٹھیرا دیا ہے، دراں حالیکہ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جب ایک تاجر اپنے سرمایے پر نفع لے سکتا ہے تو ایک سرمایہ دار اگر اپنے سرمایے پر نفع کا مطالبہ کرے تو وہ آخر مجرم کس طرح قرار

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

پاتا ہے؟ قرآن کے نزدیک یہ ایسی پاگل پن کی بات ہے کہ اس کے کہنے والوں کو جزا اور عمل میں مشابہت کے قانون کے تحت قیامت میں پاگلوں اور دیوانوں ہی کی طرح اٹھنا چاہیے۔

استاذ امام امین احسن اصلاحی سودخواروں کے اس اظہارِ تعجب پر تبصرہ کرتے ہوئے ان آیات کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اس اعتراض سے یہ بات بالکل واضح ہو کر سامنے آ گئی کہ سود کو بیع پر قیاس کرنے والے پاگلوں کی نسل دنیا میں نئی نہیں ہے، بلکہ بڑی پرانی ہے۔ قرآن نے اس قیاس کو ... لائقِ توجہ نہیں قرار دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بداہتہً باطل اور قیاس کرنے والے کی دماغی خرابی کی دلیل ہے۔ ایک تاجر اپنا سرمایہ ایک ایسے مال کی تجارت پر لگاتا ہے جس کی لوگوں کو طلب ہوتی ہے۔ وہ محنت، زحمت اور خطرات مول لے کر اس مال کو ان لوگوں کے لیے قابلِ حصول بناتا ہے جو اپنی ذاتی کوشش سے اول تو آسانی سے اس کو حاصل نہیں کر سکتے تھے اور اگر حاصل کر سکتے تھے تو اس سے کہیں زیادہ قیمت پر جس قیمت پر تاجر نے ان کے لیے مہیا کر دیا۔ پھر تاجر اپنے سرمایہ اور مال کو کھلے بازار میں مقابلہ کے لیے پیش کرتا ہے اور اس کے لیے منافع کی شرح بازار کا اتار چڑھاؤ مقرر کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس اتار چڑھاؤ کے ہاتھوں بالکل دیوالیہ ہو کر رہ جائے اور ہو سکتا ہے کہ کچھ نفع حاصل کر لے۔ اسی طرح اس معاملے میں بھی اس کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں کہ وہ ایک بار ایک روپے کی چیز ایک روپے دو آنے یا چار آنے میں بیچ کر پھر اس روپے سے ایک دھیلے کا بھی کوئی نفع اس وقت تک نہیں کما سکتا، جب تک اس کا وہ روپیہ تمام خطرات اور سارے اتار چڑھاؤ سے گزر کر پھر میدان میں نہ اترے اور معاشرے کی خدمت کر کے اپنے لیے استحقاق نہ پیدا کرے۔

بھلا بتایئے کیا نسبت ہے ایک تاجر کے اس جاں باز، غیور اور خدمت گزار سرمایہ سے ایک سود خوار کے اس سنگ دل، بزدل، بے غیرت اور دشمنِ انسانیت سرمایہ کو جو جوکھم تو ایک بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں، لیکن منافع بٹانے کے لیے سر پر سوار ہو جاتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۱/ ۶۳۲۔۶۳۳)

سود کی یہی شناعت ہے جس کی بنا پر، بیان کیا جاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الربوا سبعون حوباً ایسرھا ان ینکح الرجل امہ۔ (ابن ماجہ، رقم ۲۲۷۴)	''سود اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس کے اگر ستر حصے کیے جائیں تو سب سے ہلکا حصہ اس کے برابر ہوگا کہ آدمی اپنی ماں سے بدکاری کرے۔''

قرآنِ مجید نے اگرچہ سود لینے ہی کو حرام ٹھیرایا ہے، لیکن اس حرمت کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی ہے کہ بغیر کسی عذر کے اس کے کھلانے والے[۳۶]، لکھنے والے اور اس کے گواہوں کو بھی تعاون علی الاثم کے اصول پر یکساں مجرم قرار دیا جائے۔ چنانچہ جابر

۳۶؎ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو سود کا کاروبار کرنے والوں کے ایجنٹ کی حیثیت سے ان کے ساتھ یا ان کے قائم کردہ اداروں میں خدمات انجام دیتے ہیں۔

رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

لعن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم اکل الربٰوا و مؤکلہ و کاتبہ و شاھدیہ و قال: ھم سواء۔ (مسلم، رقم ۱۵۹۸)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے اور کھلانے والے اور اس کی دستاویز لکھنے والے اور اس دستاویز کے دونوں گواہوں پر لعنت کی اور فرمایا: یہ سب برابر ہیں۔''

اسی طرح مبادلۂ اشیا کی صورت میں ادھار کے معاملات میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ہر آلایش سے بچنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ آپ کا ارشاد ہے:

الذھب بالذھب وزناً بوزن، مثلاً بمثل والفضۃ بالفضۃ وزناً بوزن، مثلاً بمثل، فمن زاد و استزاد فھو ربًا۔ (مسلم، رقم ۱۵۸۸)

''تم سونا ادھار بیچو تو اس کے بدلے میں وہی سونا لو، اسی وزن اور اسی قسم میں اور چاندی ادھار بیچو تو اس کے بدلے میں وہی چاندی لو، اسی وزن اور اسی قسم میں، اس لیے کہ جس نے زیادہ دیا اور زیادہ چاہا تو یہی سود ہے۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

الورق بالذھب ربًا الاھاء وھاء والبر بالبر ربًا الاھاء وھاء والشعیر بالشعیر ربًا الاھاء وھاء والتمر بالتمر ربًا الاھاء وھاء۔ (مسلم، رقم ۱۵۸۶)

''سونے کے بدلے میں چاندی ادھار بیچو گے تو اس میں سود آ جائے گا۔[۳۷] گندم کے بدلے میں دوسری قسم کی گندم،[۳۸] جو کے بدلے میں دوسری قسم کے جو اور کھجور کے بدلے میں دوسری قسم کی کھجور میں بھی یہی صورت ہو گی۔ ہاں، البتہ یہ معاملہ نقدا نقد ہو تو کوئی حرج نہیں۔''

ان روایتوں کا صحیح مفہوم وہی ہے جو ہم نے اوپر اپنے ترجمہ میں واضح کر دیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا وہ یہی تھا۔ روایتیں اگر اسی صورت میں رہتیں تو لوگ ان کا یہ مدعا سمجھنے میں غلطی نہ کرتے، لیکن بعض دوسرے طریقوں

۳۷؎ یہ سد ذریعہ کی نوعیت کا حکم ہے۔ آپ نے اس اندیشے سے کہ معاملہ چونکہ ادھار کا ہے اور صنف کے اختلاف کی وجہ سے اس میں کمی بیشی تو بہرحال ہو گی، لوگوں کو اس سے منع فرمایا ہے۔

۳۸؎ اس جملے کا عطف چونکہ 'الورق بالذھب' پر ہوا ہے جس میں صنف کا اختلاف بالکل واضح ہے، اس وجہ سے عربیت کی رو سے 'البر بالبر' میں پہلے 'البر' کے معنی، ظاہر ہے کہ دوسری قسم کی گندم ہی کے ہو سکتے ہیں۔

میں راویوں کے سوءِفہم نے ان میں سے دوسری روایت سے ’ ھاء و ھاء‘ کا مفہوم پہلی روایت میں، اور پہلی روایت سے ’الذھب بالذھب‘ کے الفاظ دوسری روایت میں ’الورق بالذھب‘ کی جگہ داخل کر کے انھیں اس طرح خلط ملط کر دیا ہے کہ ان کا حکم اب لوگوں کے لیے ایک لاینحل معما ہے۔ ہماری فقہ میں ’ربا الفضل‘ کا مسئلہ اسی غتربود کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے، ورنہ حقیقت وہی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد میں واضح کر دی ہے کہ ’انما الربٰوا فی النسیئۃ[۳۹]‘ (سود صرف ادھار ہی کے معاملات میں ہوتا ہے)۔

یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ سود کا تعلق صرف انھی چیزوں سے ہے جن کا استعمال ان کی اپنی حیثیت میں انھیں فنا کر دیتا اور اس طرح مقروض کو انھیں دوبارہ پیدا کر کے ان کے مالک کو لوٹانے کی مشقت میں مبتلا کرتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس پر اگر کسی اضافے کا مطالبہ کیا جائے تو یہ عقل و نقل، دونوں کی رو سے ظلم ہے، لیکن اس کے برخلاف وہ چیزیں جن کے وجود کو قائم رکھ کر ان سے استفادہ کیا جاتا ہے اور استعمال کے بعد وہ جس حالت میں بھی ہوں، اپنی اصل حیثیت ہی میں ان کے مالک کو لوٹا دی جاتی ہیں، ان کے استعمال کا معاوضہ کرایہ ہے اور اس پر، ظاہر ہے کہ کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔

اسی طرح یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ قرض کسی غریب اور نادار کو دیا گیا ہے یا کسی کاروباری یا رفاہی اسکیم کے لیے، اس چیز کو ربا کی حقیقت کے تعین میں کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ بات بالکل مسلم ہے کہ عربی زبان میں ربا کا اطلاق قرض دینے والے کے مقصد اور مقروض کی نوعیت و حیثیت سے قطع نظر محض اس معین اضافے ہی پر ہوتا ہے جو کسی قرض کی رقم پر لیا جائے۔ چنانچہ یہ بات خود قرآنِ مجید نے واضح کر دی ہے کہ اس کے زمانۂ نزول میں سودی قرض زیادہ تر کاروباری لوگوں کے مال میں جا کر بڑھنے ہی کے لیے دیے جاتے تھے۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ، وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ۔ (الروم ۳۰: ۳۹)	’’اور جو سودی قرض تم اس لیے دیتے ہو کہ دوسروں کے مال میں پروان چڑھے تو وہ اللہ کے ہاں پروان نہیں چڑھتا، اور جو زکوٰۃ تم نے اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے دی تو اسی کے دینے والے ہیں جو اللہ کے ہاں اپنا مال بڑھاتے ہیں۔‘‘

اس میں دیکھ لیجیے ’لیربوا فی اموال الناس‘ (اس لیے کہ وہ دوسروں کے اموال میں پروان چڑھے) کے الفاظ نہ صرف یہ کہ غریبوں کو دیے جانے والے صرفی قرضوں کے لیے کسی طرح موزوں نہیں ہیں، بلکہ صاف بتاتے ہیں کہ اس

---

[۳۹] مسلم، رقم ۱۵۹۶۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

زمانے میں سودی قرض بالعموم تجارتی مقاصد ہی کے لیے دیا جاتا تھا اور اس طرح قرآنِ مجید کی تعبیر کے مطابق گویا دوسروں کے مال میں پروان چڑھتا تھا۔ یہی بات سورۂ بقرہ کی اس آیت سے بھی واضح ہوتی ہے:

وَاِنْ كَانَ ذُوْعُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ، وَ اَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌلَّكُمْ، اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ (۲:۲۸۰)

''اور اگر مقروض تنگ دست ہو تو ہاتھ کھلنے تک اسے مہلت دو، اور اگر تم بخش دو تو یہ تمھارے لیے بہتر ہے، اگر تم سمجھتے ہو۔''

استاذ امام امین احسن اصلاحی اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اس زمانے میں بعض کم سواد یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ عرب میں زمانۂ نزولِ قرآن سے پہلے جو سود رائج تھا، یہ صرف مہاجنی سود تھا۔ غریب اور نادار لوگ اپنی ناگزیر ضروریاتِ زندگی حاصل کرنے کے لیے مہاجنوں سے قرض لینے پر مجبور ہوتے تھے اور یہ مہاجن ان مظلوموں سے بھاری بھاری سود وصول کرتے تھے۔ اسی سود کو قرآن نے ربا قرار دیا ہے اور اسی کو یہاں حرام ٹھیرایا ہے۔ رہے یہ تجارتی کاروباری قرضے جن کا اس زمانے میں رواج ہے تو ان کا نہ اس زمانے میں دستور تھا، نہ ان کی حرمت و کراہت سے قرآن نے کوئی بحث کی ہے۔

ان لوگوں کا نہایت واضح جواب خود اس آیت کے اندر ہی موجود ہے۔ جب قرآن یہ حکم دیتا ہے کہ اگر قرض دار تنگ دست (ذو عسرة) ہو تو اس کو کشادگی (میسرة) حاصل ہونے تک مہلت دو تو اس آیت نے گویا پکار کر یہ خبر دے دی کہ اس زمانے میں قرض لینے والے امیر اور مال دار لوگ بھی ہوتے تھے۔ بلکہ یہاں اگر اسلوبِ بیان کا صحیح صحیح حق ادا کیجیے تو یہ بات نکلتی ہے کہ قرض کے لین دین کی معاملت زیادہ تر مال داروں ہی میں ہوتی تھی، البتہ امکان اس کا بھی تھا کہ کوئی قرض دار تنگ حالی میں مبتلا ہو کہ اس کے لیے مہاجن کی اصل رقم کی واپسی بھی ناممکن ہو رہی ہو تو اس کے متعلق یہ ہدایت ہوئی کہ مہاجن اس کو اس کی مالی حالت سنبھلنے تک مہلت دے اور اگر اصل بھی معاف کر دے تو یہ بہتر ہے۔ اس معنی کا اشارہ آیت کے الفاظ سے نکلتا ہے، اس لیے کہ فرمایا ہے کہ: 'ان كان ذو عسرة فنظرة الى ميسرة' (اگر قرض دار تنگ حال ہو تو اس کو کشادگی حاصل ہونے تک مہلت دی جائے)۔ عربی زبان میں 'ان' کا استعمال عام اور عادی حالات کے لیے نہیں ہوتا، بلکہ بالعموم نادر اور شاذ حالات کے بیان کے لیے ہوتا ہے۔ عام حالات کے بیان کے لیے عربی میں 'اذا' ہے۔ اس روشنی میں غور کیجیے تو آیت کے الفاظ سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ اس زمانے میں عام طور پر قرض دار 'ذو ميسرة' (خوش حال) ہوتے تھے، لیکن گاہ گاہ ایسی صورت بھی پیدا ہو جاتی تھی کہ قرض دار غریب ہو یا قرض لینے کے بعد غریب ہو گیا ہو تو اس کے ساتھ اس رعایت کی ہدایت فرمائی۔'' (تدبرِ قرآن ۱/ ۶۳۸۔۶۳۹)

اس کے بعد انھوں نے اپنی اس بحث کا نتیجہ اس طرح بیان کیا ہے:

''ظاہر ہے کہ مال دار لوگ اپنی ناگزیر ضروریاتِ زندگی کے لیے مہاجنوں کی طرف رجوع نہیں کرتے رہے ہوں گے،

بلکہ وہ اپنے تجارتی مقاصد ہی کے لیے قرض لیتے رہے ہوں گے۔ پھر ان کے قرض اور اس زمانے کے ان قرضوں میں جو تجارتی اور کاروباری مقاصد سے لیے جاتے ہیں، کیا فرق ہوا؟'' (تدبر قرآن ۱/ ۶۳۹)

تحریر و شہادت

[۱]

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ، وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ، وَلْيُمْلِلِ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا ، فَاِنْ كَانَ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ، وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ، فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ، وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ، وَلَا تَسْئَمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ـ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ ، فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ، وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ، وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ، وَ اِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌ بِكُمْ ـ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ، وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ، وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ ـ وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّ لَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا ، فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ، فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ، فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ ، وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ، وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ، وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ، وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ـ (البقرہ۲: ۲۸۲)

''ایمان والو، جب تم کسی مقرر مدت کے لیے ادھار کا لین دین کرو تو اسے لکھ لو اور چاہیے کہ اس کو تمھارے درمیان کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھے۔ اور جسے لکھنا آتا ہو، وہ لکھنے سے انکار نہ کرے، بلکہ جس طرح اللہ نے اسے سکھایا، وہ بھی دوسروں کے لیے لکھ دے۔ اور یہ دستاویز اسے لکھوانی چاہیے جس پر حق عائد ہوتا ہے۔ اور وہ اللہ اپنے پروردگار سے ڈرے اور اس میں کوئی کمی نہ کرے۔ پھر اگر وہ شخص جس پر حق عائد ہوتا ہے، نادان یا ضعیف ہو یا لکھوا نہ سکتا ہو تو اس کے ولی کو چاہیے کہ وہ انصاف کے ساتھ لکھوا دے۔ اور تم اس پر اپنے مردوں میں سے دو آدمیوں کی گواہی کرا لو اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں، تمھارے پسندیدہ گواہوں میں سے۔ دو عورتیں اس لیے کہ اگر ایک الجھے تو دوسری یاد دلا دے۔ اور یہ گواہ جب بلائے جائیں تو انھیں انکار نہیں کرنا چاہیے۔ اور معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا، اس کے وعدے تک اسے لکھنے میں تساہل

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

نہ کرو۔ اللہ کے نزدیک یہ طریقہ زیادہ مبنی بر انصاف ہے، گواہی کو زیادہ درست رکھنے والا ہے، اور اس سے تمھارے شبہوں میں پڑنے کا امکان کم ہو جاتا ہے۔ ہاں، اگر معاملہ روبرو اور دست گرداں نوعیت کا ہو، تب اس کے نہ لکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اور سودا کرتے وقت بھی گواہ بنا لیا کرو۔ اور (متنبہ رہو کہ) لکھنے والے یا گواہی دینے والے کو کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے۔ اور اگر تم ایسا کرو گے تو یہ وہ گناہ ہے جو تمھارے ساتھ چپک جائے گا۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور (اس بات کو سمجھو کہ) اللہ تمھیں تعلیم دے رہا ہے، اور اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔ اور اگر تم سفر میں ہو اور کوئی لکھنے والا نہ ملے تو قرض کا معاملہ رہن قبضہ کرانے کی صورت میں بھی ہو سکتا ہے۔ پھر اگر ایک دوسرے پر بھروسے کی صورت نکل آئے تو جس کے پاس (رہن کی ہوئی چیز) امانت رکھی گئی ہے، وہ یہ امانت واپس کر دے، اور اللہ، اپنے پروردگار سے ڈرتا رہے، (اور اِس معاملے پر گواہی کرا لے) اور گواہی (جس صورت میں بھی ہو، اُس) کو ہرگز نہ چھپاؤ اور (یاد رکھو کہ) جو اُسے چھپائے گا، اُس کا دل گناہ گار ہو گا اور (یاد رکھو کہ) جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُسے جانتا ہے۔''

اس آیت میں مسلمانوں کو نزاعات سے بچنے کے لیے لین دین، قرض اور اس طرح کے دوسرے مالی معاملات میں تحریر و شہادت کے اہتمام کی ہدایت کی گئی ہے۔ اس کے احکام کا جو خلاصہ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اپنی تفسیر ''تدبرِ قرآن'' میں بیان فرمایا ہے، تفہیم مدعا کے لیے وہ ہم انھی کے الفاظ میں یہاں نقل کیے دیتے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''۱۔ جب کوئی قرض کا لین دین ایک خاص مدت تک کے لیے ہو تو اس کی دستاویز لکھ لی جائے۔

۲۔ یہ دستاویز دونوں پارٹیوں کی موجودگی میں کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھے۔ اس میں کوئی دغل فشل نہ کرے اور جس کو لکھنے کا سلیقہ ہو، اس کو چاہیے کہ وہ اس خدمت سے انکار نہ کرے۔ لکھنے کا سلیقہ اللہ کی ایک نعمت ہے۔ اس نعمت کا شکر یہ ہے کہ آدمی ضرورت پڑنے پر لوگوں کے کام آئے۔ اس نصیحت کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ اُس زمانے میں لکھے پڑھے لوگ کم تھے۔ دستاویزوں کی تحریر اور اُن کی رجسٹری کا سرکاری اہتمام اس وقت تک نہ عمل میں آیا تھا اور نہ اس کا عمل میں آنا ایسا آسان تھا۔

۳۔ دستاویز کے لکھوانے کی ذمہ داری قرض لینے والے پر ہو گی۔ وہ دستاویز میں اعتراف کرے گا کہ فلاں بن فلاں کا اتنے کا قرض دار ہوں اور لکھنے والے کی طرح اس پر بھی یہ ذمہ داری ہے کہ اس اعتراف میں تقویٰ کو ملحوظ رکھے اور ہرگز صاحب حق کے حق میں کسی قسم کی کمی کرنے کی کوشش نہ کرے۔

۴۔ اگر یہ شخص کم عقل ہو یا ضعیف ہو یا دستاویز وغیرہ لکھنے لکھانے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو جو اس کا ولی ہو یا وکیل ہو، وہ اس کا قائم مقام ہو کر انصاف اور سچائی کے ساتھ دستاویز لکھوائے۔

۵۔ اس پر دو مردوں کی گواہی ثبت ہو گی جن کے متعلق ایک ہدایت یہ ہے کہ وہ 'من رجالکم'، یعنی اپنے مردوں میں سے ہوں، جس سے بیک وقت تین باتیں نکلتی ہیں: ایک یہ کہ وہ مسلمان ہوں۔ دوسری یہ کہ وہ اپنے میل جول اور تعلق کے لوگوں میں سے ہوں کہ فریقین ان کو جانتے پہچانتے ہوں۔ تیسری (ہدایت) یہ کہ وہ 'ممن ترضون'، یعنی پسندیدہ

اخلاق وعمل کے، ثقہ، معتبر اور ایمان دار ہوں۔

۶۔ اگر مذکورہ صفات کے دو مرد میسر نہ آسکیں تو اس کے لیے ایک مرد اور دو عورتوں کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ دو عورتوں کی شرط اس لیے ہے کہ اگر ایک سے کسی لغزش کا صدور ہو گا تو دوسری کی تذکیر و تنبیہ سے اس کا سدِ باب ہو سکے گا۔ یہ فرق عورت کی تحقیر کے پہلو سے نہیں ہے، بلکہ اس کی مزاجی خصوصیات اور اس کے حالات و مشاغل کے لحاظ سے یہ ذمہ داری اس کے لیے ایک بھاری ذمہ داری ہے۔ اس وجہ سے شریعت نے اس کے اٹھانے میں اس کے لیے سہارے کا بھی انتظام فرما دیا ہے۔

۷۔ جو لوگ کسی دستاویز کے گواہوں میں شامل ہو چکے ہوں، عندالطلب ان کو گواہی سے گریز کی اجازت نہیں ہے، اس لیے کہ حق کی شہادت ایک عظیم معاشرتی خدمت بھی ہے اور شہداء اللہ ہونے کے پہلو سے اس امت کے فریضۂ منصبی کا ایک جز بھی ہے۔

۸۔ قرض کے لین دین کا معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا، اگر وہ کسی مدت کے لیے ہے، دست گرداں نوعیت کا نہیں ہے تو اس کو قیدِ تحریر میں لانے سے گرانی نہیں محسوس کرنی چاہیے۔ جو لوگ اس کو زحمت سمجھ کر ٹال جاتے ہیں، وہ سہل انگاری کی وجہ سے بسا اوقات ایسے جھگڑوں میں پھنس جاتے ہیں جن کے نتائج بڑے دوررس نکلتے ہیں۔

۹۔ مذکورہ بالا ہدایات اللہ تعالیٰ کے نزدیک حق و عدالت سے قرین، گواہی کو درست رکھنے والی اور شک و نزاع سے بچانے والی ہیں۔ اس لیے معاشرتی صلاح و فلاح کے لیے ان کا اہتمام ضروری ہے۔

۱۰۔ دست گرداں لین دین کے لیے تحریر و کتابت کی پابندی نہیں ہے۔

۱۱۔ ہاں، اگر کوئی اہمیت رکھنے والی خرید و فروخت ہوئی ہے تو اس پر گواہ بنا لینا چاہیے تاکہ کوئی نزاع پیدا ہو تو اس کا تصفیہ ہو سکے۔

۱۲۔ نزاع پیدا ہو جانے کی صورت میں کاتب یا گواہ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کسی فریق کے لیے جائز نہیں ہے۔ کاتب اور گواہ ایک اہم اجتماعی و تمدنی خدمت انجام دیتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کو بلا وجہ نقصان پہنچانے کی کوشش کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ثقہ اور محتاط لوگ گواہی اور تحریر وغیرہ کی ذمہ داریوں سے گریز کرنے لگیں گے اور لوگوں کو پیشہ ور گواہوں کے سوا کوئی معقول گواہ ملنا مشکل ہو جائے گا۔ اس زمانے میں ثقہ اور سنجیدہ لوگ گواہی وغیرہ کی ذمہ داریوں سے جو بھاگتے ہیں، اس کی وجہ یہی ہے کہ کوئی معاملہ نزاعی صورت اختیار کر لیتا ہے تو اس کے گواہوں کی شامت آ جاتی ہے۔ یہ بے چارے ہتک، اغوا اور نقصانِ مال و جائداد، بلکہ قتل تک کی تعدیوں کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ قرآن نے اس قسم کی شرارتوں سے روکا کہ جو لوگ اس قسم کی حرکتیں کریں گے، وہ یاد رکھیں کہ یہ کوئی چھوٹی موٹی نافرمانی نہیں ہے جو آسانی سے معاف ہو جائے گی، بلکہ یہ ایک ایسا فسق ہے جو ان کے ساتھ چمٹ کے رہ جائے گا اور اس کے برے نتائج سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔''

(تدبر قرآن ۱/ ۶۴۰)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

آیات کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے رہن کا حکم بیان فرمایا ہے کہ آدمی سفر میں ہو اور کوئی لکھنے والا نہ ملے تو قرض کا معاملہ رہن قبضہ کرانے کی صورت میں بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بات، البتہ واضح کر دی گئی ہے کہ رہن کی اجازت صرف اسی وقت تک ہے، جب تک قرض دینے والے کے لیے اطمینان کی صورت پیدا نہیں ہو جاتی۔ اللہ کا حکم ہے کہ یہ صورت پیدا ہو جائے تو قرض پر گواہی کرا کے رہن رکھی ہوئی چیز لازماً واپس کر دینی چاہیے۔ استاذ امام اس حکم کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

''جب ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ ایک دوسرے پر اعتماد کے لیے جو باتیں مطلوب ہیں، وہ فراہم ہو جائیں، مثلاً سفر ختم کر کے حضر میں آ گئے، دستاویز کی تحریر کے لیے کاتب اور گواہ مل گئے، اپنوں کی موجودگی میں قرض معاملت کی تصدیق ہو گئی اور اس امر کے لیے کوئی معقول وجہ باقی نہیں رہ گئی کہ قرض دینے والا رہن کے بغیر اعتماد نہ کر سکے تو پھر اس کو چاہیے کہ وہ رہن کردہ چیز اس کو واپس کر دے اور اپنے اطمینان کے لیے چاہے تو وہ شکل اختیار کرے جس کی اوپر ہدایت کی گئی ہے۔ یہاں رہن کردہ مال کو امانت سے تعبیر فرمایا ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ قرض دینے والے کے پاس رہن بطور امانت ہوتا ہے جس کی حفاظت ضروری اور جس سے کسی قسم کا انتفاع ناجائز ہے۔'' (تدبر قرآن ۱/ ۶۴۳)

دو مردوں اور دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی کا جو ضابطہ ان آیات میں بیان ہوا ہے، اس کا موقع اگرچہ متعین ہے، لیکن ہمارے فقہا نے اسے جس طرح سمجھا ہے، اس کی بنا پر ضروری ہے کہ یہ دو باتیں اس کے بارے میں بھی واضح کر دی جائیں:

ایک یہ کہ واقعاتی شہادت کے ساتھ اس ضابطے کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ صرف دستاویزی شہادت سے متعلق ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ دستاویزی شہادت کے لیے گواہ کا انتخاب ہم کرتے ہیں اور واقعاتی شہادت میں گواہ کا موقع پر موجود ہونا ایک اتفاقی معاملہ ہوتا ہے۔ ہم اگر کوئی دستاویز لکھتے ہیں یا کسی معاملے میں کوئی اقرار کرتے ہیں تو ہمیں اختیار ہے کہ اس پر جسے چاہیں، گواہ بنائیں۔ لیکن زنا، چوری، قتل، ڈاکا اور اس طرح کے دوسرے جرائم میں جو شخص بھی موقع پر موجود ہوتا ہے، وہی گواہ قرار پاتا ہے۔ چنانچہ شہادت کی ان دونوں صورتوں کا فرق اس قدر واضح ہے کہ ان میں سے ایک کو دوسری کے لیے قیاس کا مبنیٰ نہیں بنایا جا سکتا۔

دوسری یہ کہ آیت کے موقع و محل اور اسلوب بیان میں اس بات کی گنجایش نہیں ہے کہ اسے قانون و عدالت سے متعلق قرار دیا جائے۔ اس میں عدالت کو مخاطب کر کے یہ بات نہیں کہی گئی کہ اس طرح کا کوئی مقدمہ اگر پیش کیا جائے تو مدعی سے اس نصاب کے مطابق گواہ طلب کرو۔ اس کے مخاطب ادھار کا لین دین کرنے والے ہیں اور اس میں انھیں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اگر ایک خاص مدت کے لیے اس طرح کا کوئی معاملہ کریں تو اس کی دستاویز لکھ لیں اور نزاع اور نقصان سے بچنے کے لیے ان گواہوں کا انتخاب کریں جو پسندیدہ اخلاق کے حامل، ثقہ، معتبر اور ایمان دار بھی ہوں اور اپنے حالات و مشاغل

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

کے لحاظ سے اس ذمہ داری کو بہتر طریقے پر پورا بھی کر سکتے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں اصلاً مردوں ہی کو گواہ بنانے اور دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد کے ساتھ دو عورتوں کو گواہ بنانے کی ہدایت کی گئی ہے تاکہ گھر میں رہنے والی یہ بی بی اگر عدالت کے ماحول میں گھبراہٹ میں مبتلا ہو تو گواہی کو ابہام و اضطراب سے بچانے کے لیے ایک دوسری بی بی اس کے لیے سہارا بن جائے۔ اس کے یہ معنی، ظاہر ہے کہ نہیں ہیں اور نہیں ہو سکتے کہ عدالت میں مقدمہ اسی وقت ثابت ہوگا، جب کم سے کم دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں اس کے بارے میں گواہی دینے کے لیے آئیں۔ یہ ایک معاشرتی ہدایت ہے جس کی پابندی اگر لوگ کریں گے تو ان کے لیے یہ نزاعات سے حفاظت کا باعث بنے گی۔ لوگوں کو اپنی صلاح و فلاح کے لیے اس کا اہتمام بہرحال کرنا چاہیے، لیکن مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لیے یہ کوئی نصاب شہادت نہیں ہے جس کی پابندی عدالت کے لیے ضروری ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ کی تمام ہدایات کے بارے میں فرمایا ہے کہ یہ طریقہ اللہ کے نزدیک زیادہ مبنی بر انصاف ہے، گواہی کو زیادہ درست رکھنے والا ہے اور اس سے شبہوں میں پڑنے کا امکان کم ہو جاتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

[۲]

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا شَھَادَۃُ بَیْنِکُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ حِیْنَ الْوَصِیَّۃِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْکُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَیْرِکُمْ، اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَاَصَابَتْکُمْ مُّصِیْبَۃُ الْمَوْتِ تَحْبِسُوْنَھُمَا مِنْ بَعْدِ الصَّلٰوۃِ فَیُقْسِمٰنِ بِاللّٰہِ، اِنِ ارْتَبْتُمْ، لَا نَشْتَرِیْ بِہٖ ثَمَنًا وَّلَوْ کَانَ ذَا قُرْبٰی وَلَا نَکْتُمُ شَھَادَۃَ اللّٰہِ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِیْنَ ۔ فَاِنْ عُثِرَ عَلٰٓی اَنَّھُمَا اسْتَحَقَّآ اِثْمًا فَاٰخَرٰنِ یَقُوْمٰنِ مَقَامَھُمَا مِنَ الَّذِیْنَ اسْتَحَقَّ عَلَیْھِمُ الْاَوْلَیٰنِ فَیُقْسِمٰنِ بِاللّٰہِ لَشَھَادَتُنَآ اَحَقُّ مِنْ شَھَادَتِھِمَا وَمَا اعْتَدَیْنَا، اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۔ ذٰلِکَ اَدْنٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِالشَّھَادَۃِ عَلٰی وَجْھِھَآ اَوْ یَخَافُوْٓا اَنْ تُرَدَّ اَیْمَانٌ بَعْدَ اَیْمَانِھِمْ، وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاسْمَعُوْا، وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ۔ (المائدہ ۵: ۱۰۶۔۱۰۸)

’’ایمان والو، جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ جائے اور وہ وصیت کر رہا ہو تو اس کے لیے گواہی اس طرح ہو گی کہ تم میں سے دو ثقہ آدمی گواہ بنائے جائیں یا اگر تم سفر میں ہو اور وہاں یہ موت کی مصیبت تمھیں آ پہنچے تو تمھارے غیروں میں سے دو دوسرے یہ ذمہ داری اٹھائیں۔ تم انھیں نماز کے بعد روک لو گے، پھر اگر تمھیں شک ہو تو وہ اللہ کی قسم کھائیں گے کہ ہم اس گواہی کے بدلے میں کوئی قیمت قبول نہ کریں گے، اگرچہ کوئی قرابت دار ہی کیوں نہ ہو اور نہ ہم اللہ کی اس گواہی کو چھپائیں گے۔ ہم نے ایسا کیا تو بے شک ہم گناہ گار ٹھیریں گے۔ پھر اگر پتا چل جائے کہ یہ دونوں کسی حق تلفی کے مرتکب ہوئے ہیں تو ان کی جگہ دوسرے دو آدمی ان لوگوں میں سے کھڑے ہوں جن کی ان پہلے گواہوں نے حق تلفی کی ہے۔ پھر وہ

اللہ کی قسم کھائیں کہ ہماری گواہی ان دونوں کی گواہی سے زیادہ برحق ہے اور ہم نے اپنی گواہی میں کوئی زیادتی نہیں کی ہے۔ ہم نے ایسا کیا ہے تو بے شک، ہم ظالم ٹھیریں۔ اس طریقے سے زیادہ توقع ہے کہ وہ ٹھیک ٹھیک گواہی دیں یا کم سے کم اس بات سے ڈریں کہ ان کی گواہی دوسروں کی گواہی کے بعد رد ہو جائے گی۔ (یہ کرو) اور اللہ سے ڈرو، اور سنو اور (یاد رکھو کہ) اللہ نافرمانوں کو کبھی راہ یاب نہیں کرتا۔''

ان آیات میں وصیت سے متعلق اسی اہتمام کی ہدایت کی گئی ہے جو اوپر لین دین اور قرض کے بارے میں بیان ہوا ہے۔ ان کے احکام کا خلاصہ درج ذیل ہے:

۱۔ کسی شخص کی موت آ جائے اور اسے اپنے مال سے متعلق کوئی وصیت کرنی ہو تو اسے چاہیے کہ اپنے مسلمان بھائیوں میں سے دو ثقہ آدمیوں کو گواہ بنا لے۔

۲۔ موت کا یہ مرحلہ اگر کسی شخص کو سفر میں پیش آئے اور گواہ بنانے کے لیے وہاں دو مسلمان میسر نہ ہوں تو مجبوری کی حالت میں وہ دو غیر مسلموں کو بھی گواہ بنا سکتا ہے۔

۳۔ مسلمانوں میں سے جن دو آدمیوں کو گواہی کے لیے منتخب کیا جائے، ان کے بارے میں اگر یہ اندیشہ ہو کہ کسی شخص کی جانب داری میں وہ اپنی گواہی میں کوئی ردوبدل کر دیں گے تو اس کے سدباب کی غرض سے یہ تدبیر کی جا سکتی ہے کہ کسی نماز کے بعد انھیں مسجد میں روک لیا جائے اور ان سے اللہ کے نام پر قسم لی جائے کہ اپنے کسی دنیوی فائدے کے لیے یا کسی کی جانب داری میں، خواہ وہ ان کا کوئی قریبی عزیز ہی کیوں نہ ہو، وہ اپنی گواہی میں کوئی تبدیلی نہ کریں گے اور اگر کریں گے تو گناہ گار ٹھیریں گے۔

۴۔ گواہوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ گواہی 'شھادۃ اللّٰہ' یعنی اللہ کی گواہی ہے، لہٰذا اس میں کوئی ادنیٰ خیانت بھی اگر ان سے صادر ہوئی تو وہ نہ صرف بندوں کے، بلکہ خدا کے بھی خائن قرار پائیں گے۔

۵۔ اس کے باوجود اگر یہ بات علم میں آ جائے کہ ان گواہوں نے وصیت کرنے والے کی وصیت کے خلاف کسی کے ساتھ جانب داری برتی ہے یا کسی کی حق تلفی کی ہے تو جن کی حق تلفی ہوئی ہے، ان میں سے دو آدمی اٹھ کر قسم کھائیں کہ ہم ان اولیٰ بالشہادت گواہوں سے زیادہ سچے ہیں۔ ہم نے اس معاملے میں حق سے کوئی تجاوز نہیں کیا اور ہم پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ اگر ہم نے ایسا کیا ہو تو خدا کے حضور میں ہم ظالم قرار پائیں۔

۶۔ گواہوں پر اس مزید احتساب کا فائدہ یہ ہے کہ اس کے خیال سے، توقع ہے کہ وہ ٹھیک ٹھیک گواہی دیں گے۔ ورنہ انھیں ڈر ہو گا کہ انھوں نے اگر کسی بدعنوانی کا ارتکاب کیا تو ان کی قسمیں دوسروں کی قسموں سے باطل قرار پائیں گی اور اولیٰ بالشہادت ہونے کے باوجود ان کی گواہی رد ہو جائے گی۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

تقسیم وراثت

[ا]

کُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَ ۨ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ، حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ـ فَمَنْ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ، اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ـ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْماً فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ، اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ـ (البقرہ۲:۱۸۰ـ۱۸۲)

''تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ پہنچے اور وہ کچھ مال چھوڑ رہا ہو تو تم پر لازم ہے کہ والدین اور قرابت مندوں کے لیے دستور کے مطابق وصیت کرو۔ خدا سے ڈرنے والوں پر یہ حق ہے۔ پھر جو اِس وصیت کو اِس کے سننے کے بعد بدل ڈالے تو اِس کا گناہ اُن بدلنے والوں پر ہی ہو گا۔ بے شک، اللہ سمیع و علیم ہے۔ جس کو البتہ، کسی وصیت کرنے والے کی طرف سے جانب داری یا حق تلفی کا اندیشہ ہو اور وہ آپس میں صلح کرا دے تو اس میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ بے شک، اللہ غفور و رحیم ہے۔''

سورۂ نساء میں تقسیم وراثت کی جو آیات اس کے بعد زیرِ بحث آئیں گی، ان میں حصوں کی تعیین اور مصحف میں ان کی جگہ صاف بتاتی ہے کہ والدین اور قرابت مندوں کے لیے دستور کے مطابق وصیت کا یہ حکم اُس وقت نازل ہوا جب وہ آیات ابھی نازل نہیں ہوئی تھیں۔ نساء کی اُن آیات میں یہ بات بھی واضح کر دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میت کے ترکہ میں والدین اور اقربا کے حصے اس لیے متعین فرمائے ہیں کہ انسان نہیں جانتا کہ ان میں سے کون بہ لحاظِ منفعت اس سے قریب تر ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے وہاں ان حصوں کو اپنی وصیت قرار دیا ہے جس کے مقابلے میں ظاہر ہے کہ کسی مسلمان کو اپنی کوئی وصیت پیش کرنے کی جسارت نہیں کرنی چاہیے۔ نساء کی آیت میں ' للرجال نصيب مما ترك الوالدان والاقربون وللنساء نصيب مما ترك الوالدان والا قربون مما قل منه او كثر، نصيباً مفروضاً[40] '، کے الفاظ بھی اسی بات پر دلالت کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ بات تو بالکل قطعی ہے کہ سورۂ بقرہ کی اس آیت کا حکم منسوخ ہو گیا ہے، لیکن یہ جب دیا گیا تو اس سے کیا چیز پیشِ نظر تھی؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی اس سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

---

[40] ۴:۷ ''والدین اور اقربا جو کچھ چھوڑیں، اس میں مردوں کا بھی ایک حصہ ہے اور والدین اور اقربا جو کچھ چھوڑیں، اس میں عورتوں کا بھی ایک حصہ ہے، خواہ یہ تھوڑا ہو یا بہت، ایک متعین حصے کے طور پر۔''

''اس آیت میں والدین اور اقربا کے لیے جو وصیت کا حکم دیا گیا، وہ معروف کے تحت تھا اور اس عبوری دور کے لیے تھا جب کہ اسلامی معاشرہ ابھی اس استحکام کو نہیں پہنچا تھا کہ تقسیم وراثت کا وہ آخری حکم دیا جائے جو سورۂ نساء میں نازل ہوا۔ اس حکم کے نزول کے لیے حالات کے سازگار ہونے سے پہلے یہ عارضی حکم نازل ہوا اور اس سے دو فائدے پیش نظر تھے: ایک تو فوری طور پر ان حصہ داروں کے حقوق کا ایک حد تک تحفظ جن کے حقوق عصبات کے ہاتھوں تلف ہو رہے تھے، اور دوسرے اس معروف کو از سر نو تازہ کرنا جو شرفاے عرب میں زمانۂ قدیم سے معتبر تھا، لیکن اب وہ آہستہ آہستہ جاہلیت کے گرد و غبار کے نیچے دب چلا تھا تا کہ یہ معروف اس قانون کے لیے ذہنوں کو ہموار کر سکے جو اس باب میں نازل ہونے والا تھا۔''

(تدبر قرآن ۱/ ۴۳۹۔۴۴۰)

[۲]

۱۔ يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ، لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ، فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ، وَ اِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ۔ (النساء ۴: ۱۱)

''تمھاری اولاد کے بارے میں اللہ تمھیں ہدایت کرتا ہے کہ لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے۔ پھر اگر اولاد میں لڑکیاں ہی ہوں اور وہ دو سے زیادہ ہوں تو انھیں ترکے کا دو تہائی دیا جائے اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو اس کے لیے آدھا ہے۔''

سورۂ نساء میں تقسیم وراثت کا یہی حکم ہے جس سے اوپر کی آیت کا حکم منسوخ ہوا ہے۔ اس میں سب سے پہلے اولاد کے حصے بیان ہوئے ہیں۔

'یوصیکم اللّٰہ فی اولادکم'، یہ جملہ 'للذکر مثل حظ الانثیین' کے لیے بطور تمہید آیا ہے۔ 'اولاد' کا لفظ، ظاہر ہے کہ مرد و عورت دونوں کے لیے عام ہے۔ چنانچہ تالیف کلام اس طرح ہو گی: 'للذکر منہم مثل حظ الانثیین'، یعنی اللہ تم کو تمھاری اولاد کے بارے میں ہدایت کرتا ہے، ان میں سے لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہو گا۔

یہ حکم اگر 'للذکر مثل حظ الانثیین' ہی پر ختم ہو جاتا تو اس کے معنی یہ تھے:

۱۔ مرنے والے کی اولاد میں اگر ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہی ہو تو لڑکے کو لڑکی کا دونا ملے گا۔

۲۔ لڑکے اور لڑکیاں اس سے زیادہ ہوں تو میت کا ترکہ اس طرح تقسیم کیا جائے گا کہ ہر لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر رہے۔

۳۔ اولاد میں صرف لڑکے یا لڑکیاں ہی ہوں تو سارا ترکہ دونوں میں سے جو موجود ہو گا، اسے دیا جائے گا۔

یہ تیسری بات بھی صاف واضح ہے کہ اس اسلوب کا لازمی تقاضا ہے۔ ہم اگر اپنی زبان میں یہ کہیں کہ یہ رقم فقیروں کے لیے ہے اور اس میں سے فقیر مرد کا حصہ دو فقیر عورتوں کے برابر ہو گا تو اس کے معنی ہی یہ ہیں کہ رقم درحقیقت فقیروں کے لیے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

دی گئی ہے، لہٰذا ان میں اگر فقیر مرد ہی ہوں گے تو ساری رقم ان میں تقسیم کر دی جائے گی اور فقیر عورتیں ہی ہوں گی تو پھر بھی یہی کیا جائے گا۔ لیکن حکم یہاں ختم نہیں ہوا، بلکہ اس سے متصل ایک استثنا کے ذریعے سے قرآن نے وضاحت کر دی ہے کہ اس کا منشا یہ نہیں ہے۔

'فان کن نساء فوق اثنتین فلھن ثلثا ما ترك'، یہ 'للذکر مثل حظ الانثیین' سے استثنا ہے۔ یعنی مرنے والے کی اولاد میں اگر لڑکیاں ہی ہوں تو خواہ دو ہوں یا دو سے زائد، ان کا حصہ ہر حال میں دو تہائی ہی ہوگا۔

'وان کانت واحدۃ فلھا النصف' یہ اسی پر عطف ہوا ہے۔ یعنی اگر ایک ہی لڑکی ہے تو وہ نصف کی حق دار ہوگی۔

'فوق اثنتین' کا مفہوم ہم نے اوپر دو یا دو سے زائد بیان کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے، ہمارے نزدیک 'اثنتین' کا لفظ عربیت کی رو سے محذوف ہے۔ قرآن کی زبان میں اگر ہم ایک لڑکی اور دو یا دو سے زائد لڑکیوں کا حصہ ان کے حصوں میں فرق کی وجہ سے الگ الگ بیان کرنا چاہیں تو اس کے دو طریقے ہیں: ترتیبِ صعودی کے مطابق بیان کرنا پیشِ نظر ہو تو پہلے ایک لڑکی اور اس کے بعد دو لڑکیوں کا حصہ بیان کیا جائے گا۔ دو سے زائد کا حصہ اگر وہی ہے جو دو کا ہے تو اسے لفظوں میں بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک کے فوراً بعد جب دو کا حصہ اس طرح بیان کیا جائے کہ وہ ایک کے حصے سے زیادہ ہو تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ دو سے زائد کا حکم بھی وہی ہے جو دو لڑکیوں کا ہے۔ اسی بات کو ہم ترتیبِ نزولی کے مطابق بیان کریں گے تو اس کے لیے 'فوق اثنتین' او 'اثنتین' کے الفاظ چونکہ عربیت کی رو سے موزوں نہ ہوں گے، اس لیے دو سے زائد کا حصہ بیان کرنے کے بعد ایک کا حصہ بیان کر دیا جائے گا۔ اس اسلوب میں 'فوق اثنتین' سے کلام کا آغاز خود دلیل ہوگا کہ اس سے پہلے 'اثنتین' کا لفظ محذوف ہے۔ غور کیجیے تو اس کا قرینہ بالکل واضح ہے۔ اس ترتیب کا حسن مقتضی ہے کہ 'فوق اثنتین' سے پہلے 'اثنتین' کا لفظ استعمال نہ کیا جائے اور صحتِ زبان کا تقاضا ہے کہ 'فوق اثنتین' سے بات شروع کی جائے تو بعد میں 'اثنتین' مذکور نہ ہو۔ قرآنِ مجید نے یہ حصے یہاں ترتیبِ نزولی کے مطابق بیان کیے ہیں، اس لیے حذف کا یہ اسلوب ملحوظ ہے۔ سورۂ نساء کی آخری آیت میں یہی حصے ترتیبِ صعودی کے مطابق بیان ہوئے ہیں۔ چنانچہ دیکھ لیجیے، وہاں 'اثنتین' کے بعد 'فوق اثنتین' کا لفظ حذف کر دیا گیا ہے: 'ان امرؤ ھلك لیس له ولد وله اخت فلھا نصف ما ترك، وھو یرثھا، ان لم یکن لھا ولد، فان کانتا اثنتین فلھما الثلثان مما ترك'[۱۴]۔

۲۔ وَلِاَبَوَیْهِ لِکُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ کَانَ لَهٗ وَلَدٌ، فَاِنْ لَّمْ یَکُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ، فَاِنْ کَانَ لَهٗ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْ بَعْدِ وَصِیَّةٍ یُّوْصِیْ بِهَآ اَوْ دَیْنٍ۔ (النساء۴:۱۱)

---

[۱۴] ۴:۱۷۶۔

’’اور اگر میت کے اولاد ہو تو اس کے والدین میں سے ہر ایک کے لیے ترکے کا چھٹا حصہ ہے اور اگر اس کے اولاد نہ ہو اور والدین ہی اس کے وارث ہوں تو ماں کا حصہ ایک تہائی ہے، اور اگر اس کے بہن بھائی ہوں تو ماں کے لیے وہی چھٹا حصہ ہے، جب کوئی وصیت جو مرنے والے نے کی ہو، وہ پوری کر دی جائے اور قرض اگر اس نے چھوڑا ہو، وہ ادا کر دیا جائے۔‘‘

اولاد کے بعد یہ اب والدین کے حصے بیان ہوئے ہیں:

’ولابویه لکل واحد منهما السدس مما ترك‘، یہ جملہ ’فان کن نساءً‘ اور ’وان کانت واحدة‘ پر نہیں، بلکہ اس پورے حکم پر عطف ہوا ہے جو اوپر اولاد کے لیے بیان ہوا ہے۔ چنانچہ اس میں عطف اب جمع کے لیے نہیں ہوگا، اسے استدراک ہی کے لیے مانا جائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ’للذکر مثل حظ الانثیین‘ میں یہ بات تو بیان ہوئی ہے کہ لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہوگا، لیکن یہ کتنا ہوگا، اسے متعین نہیں کیا گیا۔ یہ اسی طرح کا اسلوب ہے، جس طرح مثال کے طور پر ہم اپنی زبان میں یہ کہیں کہ ـــــ ’’یہ روپے بچوں کے لیے ہیں، لڑکوں کو لڑکیوں سے دونا دیجیے، اور اس میں سے آدھی رقم آپ کے ابا کے لیے ہے‘‘ ـــــ ان جملوں کو دیکھیے، ان سے قائل کا مدعا بالکل واضح ہے۔ جو شخص بھی زبان آشنا ہوگا، وہ ان سے یہی مطلب سمجھے گا کہ روپے درحقیقت بچوں کے لیے دیے گئے ہیں، اس لیے بات اگر پہلے دو جملوں ہی پر ختم ہو جاتی تو ساری رقم لڑکوں اور لڑکیوں میں اسی نسبت سے تقسیم کر دی جاتی جو ان جملوں میں بیان ہوئی ہے، لیکن قائل نے اس کے بعد چونکہ آدھی رقم ابا کو دینے کے لیے کہا ہے، اس وجہ سے یہ ضروری ہے کہ ابا کا حصہ پہلے دیا جائے اور باقی جو کچھ بچے، وہ اس کے بعد بچوں میں تقسیم کیا جائے۔ ہم نے اوپر اولاد کے حصوں کی وضاحت کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ ’فان کن نساءً، للذکر حظ الانثیین‘ سے استثنا اور اسی کے ایک پہلو کی وضاحت ہے۔ ہماری یہ بات اگر صحیح ہے تو اسے پھر ’ولابویه‘ کی طرح اپنے مقام پر مستقل نہیں مانا جا سکتا۔ اس کا حکم وہی ہونا چاہیے جو ’للذکر مثل حظ الانثیین‘ کا ہے۔ یہ اسی طرح کی بات ہے، جس طرح مثلاً ہم یہ کہیں کہ ـــــ ’’یہ ساری رقم زید، عثمان اور علی کے لیے ہے اور اس میں ان کا حصہ بالکل برابر ہے، لیکن اگر عثمان اور علی ہی ہوں تو پوری رقم کا دو تہائی عثمان اور ایک تہائی علی کو دیجیے، اور اس میں سے دس روپے ہماری بہن کو دے دیجیے گا‘‘ ـــــ ان جملوں پر غور کیجیے، ان میں اگرچہ زید کی عدم موجودگی میں عثمان اور علی کو بالترتیب پوری رقم کا دو تہائی اور ایک تہائی دینے کے لیے کہا گیا ہے، لیکن ان کے خاتمہ پر جو استدراک ہوا ہے، اس کا لازمی تقاضا ہے کہ اس رقم میں سے پہلے دس روپے بہن کو دیے جائیں، اور اس کے بعد جو کچھ بچے، وہ عثمان اور علی میں ان کے حصوں کے مطابق تقسیم کر دیا جائے۔

یہی اسلوب آیۂ زیر بحث میں بھی ہے۔ چنانچہ یہ اگر ملحوظ رہے تو اس بات کو سمجھنے میں دقت نہیں ہوتی کہ ’وان کانت واحدة فلها النصف‘ کے بعد والدین اور زوجین کے جو حصے حرف ’و‘ سے اولاد کے حصوں پر عطف ہوئے ہیں، وہ سب

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

لازماً پہلے دیے جائیں گے اور اس کے بعد جو کچھ بچے گا، صرف وہی اولاد میں تقسیم ہوگا۔ لڑکے اگر تنہا ہوں تو انھیں بھی یہی ملے گا اور لڑکے اور لڑکیاں دونوں ہوں تو ان کے لیے بھی یہی قاعدہ ہوگا۔ اسی طرح میت کی اولاد میں اگر تنہا لڑکیاں ہی ہوں تو انھیں بھی اس بچے ہوئے ترکے ہی کا دو تہائی یا آدھا دیا جائے گا، ان کے حصے پورے ترکے میں سے کسی حال میں ادا نہ ہوں گے۔

آیت کا صحیح مدعا یہی ہے۔ جو شخص بھی 'و لابویہ' میں حرف 'و' اور 'فان کن نساء' میں حرف 'ف' کی دلالت کو سمجھتے ہوئے اس آیت کو پڑھے گا، کلام کا یہ مدعا بغیر کسی تکلف کے اس پر واضح ہو جائے گا۔

اس کے بعد اب آیت کا باقی حصہ دیکھیے:

'ان کان له ولد' اور 'فان لم یکن له ولد' میں 'ولد' کا لفظ ذکور و اناث، دونوں کے لیے عام ہے۔ عربی زبان میں یہ اس معنی میں معروف ہے۔ یہ لفظ یہاں اور ازواج کے حصوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔ ہمارے نزدیک ہر جگہ اس کا مفہوم یہی ہے۔ اہلِ لغت بالصراحت کہتے ہیں کہ: 'ھو یقع علی الواحد و الجمع و الذکر و الانثی'۔ ان آیات میں اسے اولادِ ذکور کے لیے خاص کرنے کا کوئی قرینہ نہیں ہے۔ لڑکا لڑکی ایک ہوں یا دو، اولاد میں صرف لڑکے ہوں یا صرف لڑکیاں ہوں، نفی و اثبات میں اس شرط کا اطلاق بہر حال ہوگا۔

'فلامه الثلث' کے بعد عربیت کے قاعدے کے مطابق 'و لابیه الثلثان' یا اس کے ہم معنی الفاظ محذوف ہیں۔ اس محذوف کا قرینہ یہ ہے کہ قرآنِ مجید نے اس تقسیم کے لیے 'و ورثه ابواه' کی شرط عائد کی ہے۔ اس طرح یہ مذکور محذوف پر خود دلیل بن گیا ہے۔ ہم اگر یہ کہیں کہ ـــــ ''اس رقم کے وارث زید اور علی ہی ہوں تو زید کا حصہ ایک تہائی ہوگا'' ـــــ تو اس کے بعد یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ـــــ ''باقی دو تہائی علی کے لیے ہے۔''

'فان کان له اخوة فلامه السدس' کے بعد بھی ہمارے نزدیک 'و لابیه' یا اس کے ہم معنی الفاظ حذف ہو گئے ہیں۔ اس کا قرینہ بھی بالکل واضح ہے۔ بھائی بہن موجود ہوں تو ماں کا حصہ وہی ہے جو اوپر اولاد کی موجودگی میں بیان ہوا ہے۔ یہ مذکور اس بات پر خود دلیل ہے کہ باپ کا حصہ بھی وہی ہونا چاہیے۔ اس کو الفاظ میں بیان کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ پڑھنے والا قرآن کی زبان کا ذوق رکھتا ہو تو بغیر کسی تکلف کے سمجھ لے گا کہ ماں کا حصہ اصل کی طرف لوٹ گیا ہے تو باپ کا حصہ خود بخود لوٹ جائے گا۔

اس کلام کی تالیف اس طرح ہے:

> ''اولاد ہو تو ماں باپ میں سے ہر ایک کے لیے ۱/۶ ہے۔ اولاد نہ ہو اور والدین ہی وارث ہوں تو ماں کے لیے ۱/۳، لیکن اگر بھائی بہن ہوں تو ماں کے لیے وہی ۱/۶۔''

دیکھ لیجیے، کلام خود پکار رہا ہے کہ ـــــــ ''اور باپ کے لیے بھی وہی ۱/۶۔''

اس حکم سے واضح ہے کہ اولاد کی غیر موجودگی میں اللہ تعالیٰ نے بہن بھائیوں کو ان کا قائم مقام ٹھیرایا ہے۔ ہماری اس رائے کی تائید اسی سورہ کی آخری آیت سے بھی ہوتی ہے، لیکن اس کی وضاحت ہم آگے اس کے محل میں کریں گے۔

'اخوۃ' کا لفظ اس آیت میں، ہمارے نزدیک محض وجود پر دلالت کرتا ہے۔ اس سے مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ بھائی بہنوں کی موجودگی میں، عام اس سے کہ وہ ایک ہوں یا دو یا دو سے زیادہ ہوں، والدین کا حصہ اپنی اصل کی طرف لوٹ جائے گا۔ اس طرح کے اسلوب میں جمع بیانِ عدد کے لیے نہیں، محض بیانِ وجود کے لیے آتی ہے۔ ایک حماسی کا شعر ہے:

ایاك والامر الذی ان توسعت ــــــ موارده ضاقت علیك المصادر

''اس معاملے سے بچو جس میں داخل ہونے کے راستے اگر کشادہ ہیں تو نکلنے کی راہیں تنگ ہوں۔''

شاعر نے یہاں 'موارد' اور 'مصادر' کے الفاظ جمع استعمال کیے ہیں۔ بڑا ستم کرے گا وہ شخص جو اس کا مفہوم یہ بیان کرے کہ اس شعر میں ایک ایسے معاملے سے بچنے کے لیے کہا گیا ہے جس کے موارد اور مصادر بہرحال تین یا تین سے زیادہ ہوں۔ اس شعر سے معاملے میں مورد و مصدر کا وجود تو بے شک، ثابت ہوتا ہے، لیکن یہ واضح ہے کہ ان کی تعداد کا تعین شاعر کے پیشِ نظر ہی نہیں ہے۔ کسی معاملے میں ہاتھ ڈالنے اور اس سے الگ ہو جانے کا طریقہ ایک بھی ہوسکتا ہے اور یہ طریقے دس بیس بھی ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح مرنے والا اپنے پیچھے ایک بھائی یا بہن چھوڑ کر بھی رخصت ہوسکتا ہے اور اس کے بہن بھائی پانچ دس بھی ہو سکتے ہیں۔ 'اخوۃ' کا لفظ ان سب صورتوں کا احاطہ کر لیتا ہے۔ اس مفہوم کے لیے جمع کا یہ اسلوب ہر زبان میں عام ہے۔ ہم اگر یہ کہیں کہ ـــــــ ''آپ کے ہاں بچے ہوں تو یہ مٹھائی ان کو دے دیجیے گا'' ـــــــ تو کوئی شخص اس سے یہ مراد نہیں لے گا کہ اگر مخاطب کے ایک ہی بچہ ہو تو چونکہ متکلم نے لفظ ''بچے'' جمع استعمال کیا ہے، اس لیے وہ کسی حال میں مٹھائی کا حق دار نہیں ہوسکتا۔ اس جملے کا یہ مطلب وہی شخص لے سکتا ہے جو زبان کو اسالیبِ بیان کے بجائے منطق اور ریاضی کے اصولوں سے سمجھتا ہو۔

'من بعد وصیة یوصی بھا او دین' حکم کے آخر میں اس ہدایت کا منشا یہ ہے کہ اگر میت کے ذمہ قرض ہو تو سب سے پہلے اس کے ترکے میں سے وہ دیا جائے گا۔ پھر اگر کوئی وصیت مرنے والے نے کی ہو تو وہ پوری کی جائے گی اور اس کے بعد وراثت تقسیم ہوگی۔ آیت میں قرض اگرچہ لفظاً موخر ہے، لیکن حکم کے لحاظ سے اسے مقدم ہی مانا جائے گا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ قرض خواہ کا حق مرنے والے کی زندگی ہی میں قائم ہو جاتا ہے اور جن کے لیے وصیت کی گئی ہے، ان کا حق مورث کی موت سے پہلے قائم نہیں ہوتا۔ رہی آیت میں وصیت کی تقدیم تو یہ محض حسن بیان کے لیے ہے۔

۳۔ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ ، لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ، فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ، اِنَّ

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۔ (النساء۴:۱۱)

''تم نہیں جانتے کہ تمھارے والدین اور تمھاری اولاد میں سے کون بہ لحاظِ منفعت تم سے قریب تر ہے۔ یہ اللہ کا ٹھیرایا ہوا فریضہ ہے۔ بے شک، اللہ علیم و حکیم ہے۔''

سلسلۂ کلام کے بیچ میں یہ آیت جس مقصد کے لیے آئی ہے، وہ یہ ہے کہ لوگوں پر یہ بات واضح کر دی جائے کہ جن رشتہ داروں کو اللہ تعالیٰ نے کسی میت کے وارث قرار دیا ہے، ان کے بارے میں مبنی بر انصاف قانون وہی ہے جو اس نے خود بیان فرما دیا ہے۔ چنانچہ اس کی طرف سے اس قانون کے نازل ہو جانے کے بعد اب کسی مرنے والے کو اللہ کے ٹھیرائے ہوئے ان وارثوں کے حق میں وصیت کا اختیار باقی نہیں رہا۔ یہ تقسیم اللہ کے علم و حکمت پر مبنی ہے۔ اس کے ہر حکم میں گہری حکمت ہے اور اس کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ انسان اپنی بلند پروازیوں کے باوجود اس کے علم کی وسعتوں کو پا سکتا ہے اور نہ اس کی حکمتوں کو پوری طرح سمجھ سکتا ہے۔ وہ اگر بندۂ مومن ہے تو اس کے لیے زیبا یہی ہے کہ اس کا حکم سنے اور اس کے سامنے سر جھکا دے۔

آیت کا اصل مدعا یہی ہے، لیکن اگر غور کیجیے تو اس سے یہ بات بھی نہایت لطیف طریقے سے واضح ہو گئی ہے کہ وراثت کا حق جس بنیاد پر قائم ہوتا ہے، وہ قرابتِ نافعہ ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ والدین، اولاد، بھائی بہن، میاں بیوی اور دوسرے اقربا کے تعلق میں یہ منفعت بالطبع موجود ہے اور عام حالات میں یہ اسی بنا پر بغیر کسی تردد کے وارث ٹھیرائے جاتے ہیں، لیکن ان میں سے کوئی اگر اپنے مورث کے لیے منفعت کے بجائے سراسر اذیت بن جائے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے علت حکم کا یہ بیان تقاضا کرتا ہے کہ اسے وراثت سے محروم قرار دیا جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کے پیش نظر جزیرہ نمائے عرب کے مشرکین اور یہود و نصاریٰ کے بارے میں فرمایا:

لا یرث المسلم الکافر و لا الکافر المسلم ۔ (بخاری، رقم ۶۷۶۴)

''نہ مسلمان ان میں سے کسی کافر کے وارث ہوں گے اور نہ یہ کافر کسی مسلمان کے۔''

یعنی اتمام حجت کے بعد جب یہ منکرین حق خدا اور مسلمانوں کے کھلے دشمن بن کر سامنے آ گئے ہیں تو اس کے لازمی نتیجے کے طور پر قرابت کی منفعت بھی ان کے اور مسلمانوں کے درمیان ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ چنانچہ یہ اب آپس میں ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے۔

اسی طرح یہ رہنمائی بھی ضمناً اس آیت سے حاصل ہوتی ہے کہ ترکے کا کچھ حصہ اگر بچا ہوا رہ جائے اور مرنے والے نے کسی کو اس کا وارث نہ بنایا ہو تو اسے بھی 'اقرب نفعاً' ہی کو ملنا چاہیے۔

مسلم کی ایک روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی بات فرمائی ہے:

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

الحقوا الفرائض باھلھا ، فما ترکت الفرائض فھو لاولی رجل ذکر۔ (رقم۱۶۱۵)

''وارثوں کو ان کا حصہ دو، پھر اگر کچھ بچے تو وہ قریب ترین مرد کے لیے ہے۔''

۴۔ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ، فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ، وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ، فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۔ (النساء۴:۱۲)

''اور تمھاری بیویوں نے جو کچھ چھوڑا ہو، اس کا نصف تمھیں ملے گا، اگر ان کے اولاد نہیں ہے۔ اور اگر وہ صاحب اولاد ہیں تو ترکے کا ایک چوتھائی حصہ تمھارا ہے جب کہ وصیت جو انھوں نے کی ہو، وہ پوری کر دی جائے اور قرض جو ان کے ذمہ ہو، وہ ادا کر دیا جائے۔ اور ان کے لیے تمھارے ترکے کا چوتھائی ہے، اگر تمھارے اولاد نہیں ہے اور اگر اولاد ہو تو تمھارے ترکے کا آٹھواں حصہ ان کا ہے، جب کہ وصیت جو تم نے کی ہو، وہ پوری کر دی جائے اور قرض جو تم نے چھوڑا ہو، وہ ادا کر دیا جائے۔''

یہ زوجین کے حصے ہیں اور ہر لحاظ سے واضح ہیں۔ ان میں لفظ و معنی کے اعتبار سے کوئی مشکل نہیں ہے۔ 'و لا بویہ' پر عطف کی وجہ سے مرنے والے کی وصیت کی تعمیل اور اس کا قرض ادا کر دینے کے بعد والدین کے حصوں کی طرح یہ حصے بھی پورے ترکے میں سے دیے جائیں گے۔

۵۔ وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ، فَاِنْ كَانُوْآ اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِی الثُّلُثِ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ، غَيْرَ مُضَآرٍّ، وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ، وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ۔ (النساء۴:۱۲)

''اور اگر کسی مرد یا عورت کو اِس کے کلالہ تعلق کی بنا پر وارث بنایا جاتا ہے اور اس کا ایک بھائی یا ایک بہن ہے تو بھائی اور بہن، ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔ اور اگر وہ اس سے زیادہ ہوں تو ایک تہائی میں سب شریک ہوں گے، جب کہ وصیت جو کی گئی ہو، وہ پوری کر دی جائے اور قرض جو ہو، وہ ادا کر دیا جائے، بغیر کسی کو ضرر پہنچائے۔ یہ وصیت ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ علیم و حلیم ہے۔''

اولاد، والدین اور زوجین کے بعد اب یہ دوسرے قرابت مندوں سے متعلق ہدایت فرمائی ہے۔

'کلالۃ' اس آیت میں اہم ترین لفظ ہے۔ اپنی اصل کے لحاظ سے یہ 'کلال' یعنی ضعف و عجز کے معنی میں مصدر ہے۔ اعشیٰ کا مصرع ہے:

فآليت لا ارثى لها من كلالة

''تب میں نے قسم کھائی کہ میں اس پر اس کے ضعف و عجز کی وجہ سے رحم نہ کروں گا۔''

متمم بن نویرہ کہتا ہے:

فکانها بعد الکلالة و السری　　علج تغالیه قذور ملمع

''وہ اونٹنی رات کے سفر اور تھکاوٹ کے بعد گویا وہ جنگلی گدھا ہے جس سے گابھن گدھی بھی آگے بڑھنے کی کوشش کرتی ہے۔''

باعتبارِ مجاز ائمۂ لغت نے بالعموم اس کے تین معنی بیان کیے ہیں:

ایک وہ شخص جس کے پیچھے اولاد اور والد دونوں میں سے کوئی نہ ہو،

دوسرے وہ قرابت جو اولاد اور والد کی طرف سے نہ ہو،

تیسرے کسی شخص کے وہ رشتہ دار جن کا تعلق اس کے ساتھ اولاد اور والد کا نہ ہو۔

زمخشری ''الکشاف'' میں لکھتے ہیں:

ینطلق علی ثلاثة : علی من لم یخلف ولدا ولا والدا وعلی من لیس بولد ولا والد من المخلفین و علی القرابة من غیر جهة الولد والوالد ، و منه قولهم: ماورث المجد عن کلالة کما تقول: ما صمت عن عی وما کف عن جبن ۔ والکلالة فی الاصل مصدر بمعنی الکلال وهوذهاب القوة من الاعیاء، قال الاعشی: فآلیت لا ارثی لها من کلالة ، فاستعیرت للقرابة من غیر جهة الولد والوالد لانها بالاضافة الی قرابتهما کالة ضعیفة، واذا جعل صفة للموروث او الوارث فبمعنی ذی کلالة کما تقول : فلان من قرابتی ، ترید فلان

''کلالہ کے تین معنی ہیں: یہ اس شخص کے لیے اسم صفت ہے جس کے پیچھے اولاد اور والد، دونوں میں سے کوئی نہ ہو اور ان پس ماندگان کے لیے بھی جن کا تعلق مرنے والے سے اولاد اور والد کا نہ ہو۔ اس کا اطلاق اس قرابت پر بھی ہوتا ہے جو اولاد اور والد کی طرف سے نہ ہو۔ عرب کہتے ہیں: 'ماورث المجد عن کلالة' (وہ دور کے تعلق سے بزرگی کا وارث نہیں ہوا)۔ اسی طرح تم کہتے ہو: 'ما صمت عن عی' (وہ گفتگو میں عاجز رہ جانے کی وجہ سے خاموش نہیں ہوا) اور 'ما کف عن جبن' (وہ بزدلی کی وجہ سے نہیں رکا)۔ اور کلالہ اصل میں بمعنی 'کلال' مصدر ہے اور 'کلال' کے معنی ہیں: عجز کی وجہ سے قوت کا جاتے رہنا۔ اعشیٰ کا مصرع ہے: 'فآلیت لا ارثی لها من کلالة' (تب میں نے قسم کھائی کہ میں اس پر اس کے ضعف و عجز کی وجہ سے رحم نہ کروں گا)۔ پھر یہ مجازی طور پر اس قرابت کے لیے مستعمل ہوا جو والد اور اولاد

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

من ذوی قرابتی و یجوزان یکون صفة کالھجاجة والفقاقة للاحمق۔ (۱/۴۸۵)

اولاد کی طرف سے نہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ قرابت اس قرابت کی نسبت ضعیف ہے جو والد اور اولاد کی طرف سے ہوتی ہے۔ اور اسے جب مورث یا وارث کے لیے صفت قرار دیا جاتا ہے تو یہ 'ذو کلالة' کے معنی میں ہوتا ہے۔ اسی طریقے پر تم 'فلان من قرابتی' یعنی 'فلان من ذوی قرابتی' بولتے ہو اور یہ 'ھجاجة' اور 'فقاقة' بمعنی احمق کی طرح اسم صفت بھی ہو سکتا ہے۔''

پہلے معنی، یعنی اس شخص کے لیے جس کے پیچھے اولاد اور والد، دونوں میں سے کوئی نہ ہو۔ اس کا استعمال اگرچہ اصولِ عربیت کے مطابق ہے، لیکن اس کی کوئی نظیر کلامِ عرب میں ہم کو نہیں مل سکی۔

دوسرے معنی، یعنی اس قرابت کے لیے جو اولاد اور والد کی طرف سے نہ ہو، اس کے استعمال کے نظائر کلامِ عرب میں عام ہیں۔

طرماح کہتا ہے:

یھز سلاحا لم یرثه کلالة ۔۔۔ یشك به منھا غموض المغابن

''وہ اپنا ہتھیار ہلاتا ہے جس کا وارث وہ دور کے تعلق سے نہیں ہوا۔ وہ اس سے اس کی رانوں کے چھپے ہوئے حصے کو چھید ڈالتا ہے۔''

عامر بن طفیل کا مصرع ہے:

وما سودتنی عامر عن کلالة

''اور قبیلۂ عامر نے مجھے دور کے تعلق کی وجہ سے سردار نہیں بنایا۔''

لسان العرب میں ہے:

والعرب تقول: لم یرثه کلالة ای لم یرثه عن عرض، بل عن قرب واستحقاق۔ (۱۱/۵۹۲)

''عرب کہتے ہیں: 'لم یرثه کلالة' یعنی وہ دور کے تعلق سے وارث نہیں ہوا، بلکہ اس نے وراثت قرب واستحقاق کی وجہ سے پائی ہے۔''

تیسرے معنی، یعنی کسی شخص کے ان رشتہ داروں کے لیے جن کے ساتھ اس کا تعلق اولاد اور والد کا نہ ہو، اس کا استعمال قطعی شواہد سے ثابت ہے:

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حماسی شاعر یزید بن الحکم الثقفی اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہتا ہے:

والمرء یبخل بالحقوق وللکلالۃ مایسیم

''انسان حقوق ادا کرنے میں بخل سے کام لیتا ہے اور اس کے مرنے کے بعد اس کے جنگل میں چرنے والے جانور دور کے رشتہ دار لے جاتے ہیں۔''

ازہری نے ایک شاعر کا شعر نقل کیا ہے:

فان ابا المرء احمی لہ ومولی الکلالۃ لا یغضب

''آدمی پر ظلم کیا جائے تو اس کی حمایت میں اس کا باپ ہی سب سے بڑھ کر غضب ناک ہوتا ہے۔ کلالہ رشتہ دار آدمی کے لیے اس کے باپ کی طرح غضب ناک نہیں ہوتے۔''

ایک اعرابی کا قول ہے:

مالی کثیر و یرثنی کلالۃ متراخ نسبھم۔ (لسان العرب ۵۹۲/۱۱)

''میرے پاس مال بہت زیادہ ہے اور میرے وارث دور کے رشتہ دار ہیں۔''

امام مسلم نے جابر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ان کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

یا رسول اللّٰہ، انما یرثنی کلالۃ۔ (رقم ۱۶۱۶)

''اے اللہ کے رسول، میرے وارث صرف کلالہ ہیں۔''

بہت سی تفسیری روایتوں میں بھی یہ معنی بیان ہوئے ہیں۔ ابوبکر جصاص ''احکام القرآن'' میں لکھتے ہیں:

وروی عن ابی ابکر الصدیق و علی وابن عباس فی احدی الروایتین ان الکلالۃ ماعدا الوالد والولد، وروی محمد بن سالم عن شعبی عن ابن مسعود انہ قال: الکلالۃ ماخلا الوالد والولد، و عن زید بن ثابت مثلہ۔ (۸۷/۲)

''سیدنا ابوبکر صدیق، سیدنا علی اور حضرت ابن عباس سے اس باب میں جو دو روایتیں ہیں، ان میں سے ایک میں ہے کہ باپ اور اولاد کے سوا سب کلالہ ہیں اور محمد بن سالم نے شعبی سے اور انھوں نے حضرت ابن مسعود سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا: باپ اور اولاد کے سوا سب کلالہ ہیں۔ اور حضرت زید بن ثابت سے بھی یہی معنی روایت ہوئے ہیں۔''

اب آیۂ زیر بحث میں دیکھیے، جہاں تک پہلے معنی کا تعلق ہے، فقہا نے اگرچہ یہاں بالاتفاق وہی مراد لیے ہیں، لیکن آیت ہی میں دلیل موجود ہے کہ یہ معنی یہاں مراد لینا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔

غور فرمایئے، 'یوصیکم اللّٰہ فی اولادکم' سے جو سلسلۂ بیان شروع ہوتا ہے، اس میں اولاد اور والدین کا حصہ بیان

کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے وصیت پر عمل درآمد کی تاکید 'من بعد وصیة یوصی بھا او دین' کے الفاظ میں کی ہے۔ زوجین کے حصوں میں اسی مقصد کے لیے 'من بعد وصیة یوصین بھا او دین' اور 'من بعد وصیة توصون بھا او دین' کے الفاظ آئے ہیں۔ تدبر کی نگاہ سے دیکھیے تو ان سب مقامات پر فعل مبنی للفاعل (معروف) استعمال ہوا ہے اور 'یوصی'، 'یوصین' اور 'توصون' میں ضمیر کا مرجع ہر جملے میں بالصراحت مذکور ہے۔ لیکن قرآن کا ایک طالب علم اس حقیقت سے صرف نظر نہیں کر سکتا کہ کلالہ کے احکام میں یہی لفظ مبنی للمفعول (مجہول) ہے۔ یہ تبدیلی صاف بتا رہی ہے کہ 'ان کان رجل یورث کلالة او امرأة' میں 'یوصی' کا فاعل، یعنی مورث مذکور نہیں ہے، اس وجہ سے اس آیت میں 'کلالة' کو کسی طرح مرنے والے کے لیے اسم صفت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ تغیر حجت قاطع ہے کہ قرآن مجید نے یہ لفظ یہاں پہلے معنی میں، یعنی اس شخص کے لیے جس کے پیچھے اولاد اور والد، دونوں میں سے کوئی نہ ہو، استعمال نہیں کیا ہے۔

اب رہے دوسرے اور تیسرے معنی تو ان میں سے جو بھی مراد لیے جائیں، آیت کا مدعا چونکہ ایک ہی رہتا ہے، اس لیے ترجیح محض حسن تالیف کے لحاظ سے ہو گی۔

چنانچہ آیت میں 'یورث' ہمارے نزدیک، باب افعال سے مبنی للمفعول ہے۔ 'کلالة' اس سے مفعول لہ ہے۔ 'کان' یہاں ناقصہ ہے اور 'یورث' اس کی خبر واقع ہوا ہے۔ 'رجل او امرأة'، 'کان' کے لیے اسم ہیں۔ اس تالیف کی رو سے اس کا ترجمہ یہ ہو گا:

''اور اگر کسی مرد یا عورت کو اس کے کلالہ تعلق کی بنا پر وارث بنایا جاتا ہے۔''

وارث بنانے کا اختیار، ظاہر ہے کہ مرنے والے ہی کو ہو گا اور 'یورث' کا دوسرا مفعول چونکہ یہاں بیان نہیں ہوا، اس وجہ سے عربیت کی رو سے اس کے معنی اس سیاق میں یہی ہو سکتے ہیں کہ ان وارثوں کے علاوہ یا ان کے بعد یا ان کی عدم موجودگی میں ترکے کا وارث بنا دیا جاتا ہے جن کے حصے اوپر بیان ہوئے ہیں۔

'ولہ اخ او اخت فلکل واحد منھما السدس، فان کانوا اکثر من ذلک فھم شرکاء فی الثلث، من بعد وصیة یوصی بھا او دین'، یعنی ایک ہی رشتہ کے متعلقین میں سے اگر کسی ایک مرد یا عورت کو وارث بنایا جاتا ہے تو جس کو وارث بنایا جائے گا، اس کا ایک بھائی یا ایک بہن ہو تو اس مال کا چھٹا حصہ جس کا اسے وارث بنایا گیا ہے، اس کے بھائی یا بہن کو دیا جائے گا اور اگر اس کے بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں تو وہ سب ایک تہائی میں برابر کے شریک ہوں گے۔ اس کے بعد یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ باقی ۵/۶ یا دو تہائی اس مرد یا عورت کو دیا جائے گا جسے وارث بنایا گیا ہے۔ ہم اگر یہ کہیں کہ ــــــ ''زید نے اس رقم کا وارث آپ کے بیٹے کو بنایا ہے، لیکن اس کا کوئی بھائی ہو تو ایک تہائی کا حق دار وہ ہو گا'' ــــــ تو اس جملے کا مطلب ہر شخص یہی سمجھے گا کہ بھائی کا حصہ دینے کے بعد باقی روپیہ اس بیٹے کو دیا جائے گا جسے رقم کا وارث بنایا گیا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

قرآنِ مجید کی یہ ہدایت بڑی حکمت پر مبنی ہے۔ مرنے والا کلالہ رشتہ داروں میں سے اپنے کسی بھائی، بہن، ماموں، پھوپھی یا چچا وغیرہ کو وارث بنا سکتا ہے۔ لیکن، ظاہر ہے کہ جس بھائی یا ماموں کو وارث بنایا جائے گا، مرنے والے کے بھائی اور ماموں اس کے علاوہ بھی ہو سکتے ہیں۔ یہی معاملہ چچا، پھوپھی اور خالہ وغیرہ کا ہے۔ کوئی شخص اپنے ذاتی رجحان کی بنا پر کسی ایک ماموں یا پھوپھی کو ترجیح دے سکتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے اس کو پسند نہیں فرمایا کہ ایک ہی رشتہ کے دوسرے متعلقین بالکل محروم کر دیے جائیں۔ چنانچہ اس کے لیے یہ ہدایت فرمائی کہ کوئی شخص اگر، مثال کے طور پر، اپنے چچا زید کو باقی ترکے کا وارث بنا دیتا ہے اور اس کے چچا عثمان اور احمد بھی ہیں تو ترکے کے جس حصے کا وارث زید کو بنایا گیا ہے، اس کا ایک تہائی عثمان اور احمد میں تقسیم کرنے کے بعد باقی ترکہ زید کو دیا جائے گا۔

'غیر مضار، وصیة من اللّٰه، واللّٰه علیم حلیم'، آیت کے آخر میں یہ الفاظ اس تنبیہ کے لیے آئے ہیں کہ وارث بنانے کا یہ عمل کسی حق دار کے لیے ضرر کا موجب نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے وصیت میں ضرر رسانی کو روکنے کے لیے اصل وارثوں کے حصے خود مقرر فرما دیے ہیں، لیکن آیت کلالہ کی رو سے چونکہ مرنے والا اپنی مرضی سے کسی رشتہ دار کو وارث بنا سکتا ہے، اس لیے یہ حکم بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ اس حق کو استعمال کرتے ہوئے کسی کی حق تلفی نہیں ہونی چاہیے۔ یہ ہما شما کا مشورہ نہیں ہے، پروردگار عالم کی وصیت ہے۔ اس کا بندہ جانتے بوجھتے کسی حق دار کو محروم کرتا ہے تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ اس کے ہر عمل سے باخبر ہے اور اگر بے جانے بوجھے اس سے کوتاہی ہو جاتی ہے تو اس کا خالق بردبار ہے، اپنے بندوں کے گناہوں کو معاف کرتا ہے۔ وہ نرم خو ہے، بندوں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ اس کے حکموں میں ان کے لیے سہولت ہے، تنگی اور مشقت نہیں ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

۶۔ يَسْتَفْتُوْنَكَ، قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ، اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗٓ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ، وَهُوَ يَرِثُهَآ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ، فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ، وَاِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ، يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا، وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ۔ (النساء ۴: ۱۷۶)

''لوگ تم سے فتویٰ پوچھتے ہیں، کہو: اللہ تمھیں کلالہ وارثوں کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے: اگر کوئی شخص بے اولاد مر جائے اور اس کی ایک بہن ہی ہو تو اس کے لیے ترکے کا نصف ہے اور اگر بہن بے اولاد مرے تو بھائی اس کا وارث ہوگا اور بہنیں اگر دو ہوں تو اس کے ترکے میں سے دو تہائی پائیں گی۔ اگر کئی بھائی بہن، مرد عورتیں ہوں تو مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہوگا۔ اللہ تمھارے لیے وضاحت کرتا ہے تاکہ تم بھٹکتے نہ پھرو اور اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔''

اس سے پہلے 'ان کان رجل یورث کلالة' کی جو تاویل اوپر بیان ہوئی ہے، اس کی رو سے چونکہ بہن بھائی، چچا

ماموں، خالہ پھوپھی وغیرہ سب کلالہ ہیں اور مورث ان میں سے جس کو چاہے ترکے کا وارث بنا سکتا ہے، اس لیے ہوسکتا تھا کہ وہ کسی چچا ماموں یا خالہ پھوپھی وغیرہ کو اپنے بھائی بہنوں پر ترجیح دے۔ مرنے والے کے اولاد ہو تو یہ صورت ہر لحاظ سے مناسب ہے، لیکن مورث بے اولاد ہو اور اس کے بھائی بہن ہوں تو یہ اختیار قابل اعتراض ٹھیرتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اولاد کے بعد باقی سب قرابت مندوں میں بھائی بہن ہی اقرب ہیں۔ عقل تقاضا کرتی ہے کہ اس صورت میں ترکے کا بڑا حصہ انھیں ملنا چاہیے۔ اس سے پہلے بیان ہو چکا ہے کہ بہن بھائی ہوں تو والدین میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصہ ملے گا۔ یہ حصہ چونکہ وہی ہے جو انھیں اولاد کی موجودگی میں ملتا ہے، اس لیے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس صورت میں بھی کیا مرنے والے کو یہ اختیار ہے کہ وہ چاہے تو بھائی بہنوں کو وارث بنائے اور چاہے تو انھیں محروم کر دے؟ ہم نے آیات کی شرح کرتے ہوئے اوپر ایک جگہ لکھا ہے کہ اسلوب بیان سے یہ بات نکلتی ہے کہ اولاد کی غیر موجودگی میں میت کے وارث اس کے بھائی بہن ہیں، لیکن اسلوب بیان کی یہ دلالت، ظاہر ہے کہ دلالت الفاظ کی طرح ہر احتمال سے خالی نہیں ہے کہ اس مسئلے پر بحث کی گنجایش باقی نہ رہے۔ اولاد موجود نہ ہو تو بھائی بہنوں کے بارے میں یہ سوال آج بھی پیدا ہوسکتا ہے اور عہدِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی پیدا ہوا۔ جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

يقول : دخل علی رسول اللّٰه صلی اللّٰه عليه و سلم و انا مريض ، لا اعقل ، فتوضاء فصبوا علی من وضوئه فعقلت ، فقلت: يا رسول اللّٰه، انما يرثنی كلالة ، فنزلت آية الميراث ۔ (مسلم، رقم ۱۶۱۶)	''وہ فرماتے ہیں: میں بیمار تھا اور مجھ پر بے ہوشی کا غلبہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں تشریف لائے۔ آپ نے وضو کیا تو لوگوں نے آپ کے وضو کے پانی سے میرے اوپر چھینٹا دیا۔ مجھے ہوش آیا تو میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول، میرے وارث صرف کلالہ ہیں تو اس پر آیتِ میراث[۴۲] نازل ہوئی۔''

اس حدیث کے الفاظ: 'انما يرثنی كلالة فنزلت آية الميراث' سے یہ بات صاف واضح ہوتی ہے کہ سوال کلالہ رشتہ داروں میں سے بالخصوص بھائی بہنوں کی میراث کے بارے میں تھا اور سورۂ نساء کی یہ آخری آیت اسی استفتا کے جواب میں نازل ہوئی ہے۔

قرآن کا ایک خاص اسلوب یہ ہے کہ اس میں سوالات نہایت اجمال کے ساتھ نقل ہوتے ہیں۔ چنانچہ سوال کی نوعیت، اس کا موقع و محل اور اطراف و جوانب بالعموم اس جواب ہی سے واضح ہوتے ہیں جو اس کے بعد قرآن دیتا ہے۔ اس چیز کو ملحوظ

---

۴۲ روایتوں میں وضاحت ہے کہ آیتِ میراث سے مراد یہاں سورۂ نساء کی یہی آخری آیت ہے جس میں بھائی بہنوں کے حصے بیان ہوئے ہیں۔ اسی طرح یہ بات بھی بعض روایتوں میں بہ صراحت بیان ہوئی ہے کہ ان کے وارثوں میں صرف بہنیں ہی تھیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

نہ رکھنے کی وجہ سے لوگوں کو 'قل اللّٰہ یفتیکم فی الکلالة ' کی تاویل میں بڑی الجھنیں پیش آئی ہیں، دراں حالیکہ یہاں بھی سوال کو اگر جواب کے لحاظ سے دیکھا جائے تو متکلم کا منشا بغیر کسی ابہام کے واضح ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس میں اگر غور کیجیے تو وہی اسلوب ہے جو 'یوصیکم اللّٰہ فی اولادکم' میں ہے۔ وہاں وصیت میت کی وارث اولاد کے بارے میں ہے اور یہاں فتویٰ میت کے وارث کلالہ رشتہ داروں کے بارے میں ہے۔ لفظ 'کلالة' پر الف لام دلیل ہے کہ سوال کلالہ وارثوں میں سے کچھ مخصوص اقربا سے متعلق ہے اور جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اقربا میت کے بھائی بہن ہیں۔ تمام کلالہ رشتہ داروں، مثلاً چچا ماموں، بھائی بہن، خالہ پھوپھی میں سے کسی کو وارث بنا دینے کی اجازت آیاتِ میراث میں بیان ہو چکی ہے۔ یہاں عام کے بعد خاص کا ذکر ہے۔ یہ چیز ملحوظ رہے تو آیت کا مفہوم یہ ہوگا: کہہ دو، اللہ تمھیں کلالہ رشتہ داروں میں سے بھائی بہنوں کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے۔ اس اسلوب کی نظیر سورۂ بقرہ کی آیت 'یسئلونك عن الاھلة'[۴۳] میں موجود ہے۔

'ان امرؤ ھلك لیس له ولد'، یہ بھائی بہنوں کے میراث پانے کے لیے اسی طریقے پر شرط ہے، جس طرح 'فان لم یکن له ولد وورثه ابواه' میں ہے۔ وہاں معنی یہ ہیں کہ میت بے اولاد ہو اور ماں باپ ہی وارث ہوں تو ان کا حصہ یہ ہوگا اور یہاں مفہوم یہ ہے کہ مرنے والے کے اولاد نہ ہو اور اس کے بھائی بہن ہوں تو ان کا حصہ اس طرح ہے۔ اس شرط سے واضح ہے کہ بھائی بہن صرف اولاد کی غیر موجودگی میں وارث ہوتے ہیں۔ اولاد موجود ہو تو میت کے ترکہ میں ان کا کوئی حصہ مقرر نہیں ہے، الّا یہ کہ مرنے والا النساء کی آیت ۱۲ میں کلالہ کے حکمِ عام کے تحت ان میں سے کسی کو وارث بنا دے۔

بھائی بہنوں کے جو حصے یہاں بیان ہوئے ہیں، ان میں اور اولاد کے حصوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ 'ان کانوا اخوة رجالا ونساء فللذکر مثل حظ الانثیین' کا اسلوب دلیل ہے کہ یہ حصے بھی والدین اور احد الزوجین کا حصہ دینے کے بعد باقی ترکے میں سے دیے جائیں گے۔ اس کے دلائل ہم اولاد کے حصوں کی وضاحت کرتے ہوئے بیان کر چکے ہیں۔ چنانچہ ترکے کا جو حصہ بھائی بہنوں میں تقسیم کیا جائے گا، میت کی صرف بہنیں ہی ہوں تو قرآن کی ہدایت کے مطابق، انھیں بھی اسی کا دو تہائی اور اسی کا نصف ادا ہوگا۔

یہ بات، جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا ہے، آیت ۱۱، ۱۲ سے بھی واضح تھی کہ اولاد کی عدم موجودگی میں بھائی بہن اس کے قائم مقام ہیں، لیکن نساء کی اس آیتِ تبیین نے اسے بالفاظ صریح بیان کر دیا ہے۔ وہاں ممکن تھا کہ اسلوب بیان کی دلالت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگ غلطی میں پڑ جاتے۔ اس وضاحت کے بعد یہ احتمال باقی نہیں رہا۔ چنانچہ فرمایا ہے: یبین اللّٰہ لکم ان تضلوا، واللّٰہ بکل شیء علیم۔

۴۳؎ ۲: ۱۸۹۔ ملاحظہ ہو: تدبرِ قرآن، امین احسن اصلاحی ۱/ ۴۷۱۔

—— جاوید

O

پھر ہوئے زینت دیوارِ حرم اے ساقی
توڑ ڈالے تھے جو پتھر کے صنم اے ساقی

راہ رو گرم سفر پشت بہ منزل ہو کر
ہے یہی آج بھی تقدیرِ امم اے ساقی

مے کدہ چھوڑ تو دیں تیری جفا پر، لیکن
یاد آجاتا ہے پھر تیرا کرم اے ساقی

تیری صحبت ہی وہ فردوس ہے دنیا میں جہاں
کوئی اندیشۂ فردا ہے نہ غم اے ساقی

روے زیبا نہ سہی ، گردشِ مینا ہی سہی
کچھ تو رہ جائے فقیروں کا بھرم اے ساقی

روح خاموش ہے صدیوں سے، بدن گرم سرود
اب کہاں سوزِ عرب ، سازِ عجم اے ساقی !

ہم وہ مے کش ہیں کہ منت کشِ صہبا نہ ہوئے
مانگ لائے ہیں رگِ تاک سے نم اے ساقی

دین تو تھا ہی سیاست بھی ہے ملا کے سپرد
اور باقی ہے کوئی ہم پہ ستم اے ساقی ؟

عقل ہو جاتی ہے منزل سے گریزاں جب بھی
دیکھ لیتے ہیں ترا نقشِ قدم اے ساقی

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org